رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

نگار

قواعد رسالہ "نگار"

۱۔ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے۔
۲۔ رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا
۳۔ خط وکتابت کیوقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جسپر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضایع کر دیئے جاتے ہیں
۴۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔
۵۔ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئیں۔
۶۔ سالانہ قیمت پانچ روپیہ۔ ششماہی تین روپیہ۔ بیرون ہند سات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے۔

نرخنامہ اجرت اشتہارات

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دیں گے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے۔

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۴ روپیہ
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

چوتھائی قیمت پیشگی آنی لازم ہے

سیلیے ہر کتاب ضرور منگوائیے

مولانا نذیر احمد

- نبات النعش ۹ر
- مراۃ العروس ۱۰ر
- توبۃ النصوح ۱۲ر
- موعظہ حسنہ عہ
- رویائے صادقہ عہ
- ایامیٰ عہ
- فسانۂ مبتلا عہ
- ابن الوقت عہ
- مصائب غدر ۱۲ر

مولانا شبلی

- سیرۃ النبی جلد اول عہ
- " دوم ہہ
- " سوم عہ
- الفاروق عا
- سیرۃ النعمان عہ
- الغزالی عہ
- المامون عہ
- سوانح مولانا روم عا
- سفرنامہ مصر و شام عا
- علم الکلام عا
- الکلام عا
- رسائل شبلی عہ
- مقالات شبلی عہ
- شعر العجم جلد اول ے
- " دوم عا
- " سوم عا
- " چہارم ے
- " پنجم عا
- موازنہ انیس و دبیر ے

- مضامین عالمگیر ۱ر
- آغاز اسلام ۱ر
- کلیات فارسی عا
- کلام شبلی اردو ۱ر

امیر مینائی

- صنم خانۂ عشق عا
- مراۃ الغیب عہ
- محامد خاتم النبیین ۱ر
- ضیائے سخن عہ
- مکاتیب امیر مینائی عا

رتن ناتھ سرشار

- سیر کہسار ہہ
- خدائی فوجدار عا
- جام سرشار عا
- الف لیلہ بطرز ناول صر
- کامنی ہہ
- سوانح عمر و عیار عہ

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذی ۱ر
- حاجی بغلول ۱ر

- پیاری دنیا ۱ر
- کایا پلٹ ۱ر
- میٹھی چھری ۱ر
- طرحدار لونڈی عہ
- طلسمی فانوس ۱ر

جوالا پرشاد برق

- مرنا لنی ۱۲
- مار آستین ۱۲
- بنگالی دلہن ۱۲
- معشوقۂ فرنگ ۱۲

بسم اللہ

(صفحہ ۸۰ کا اعلان ملاحظہ فرمائیے) (صفحہ ۸۰ کا اعلان ملاحظہ فرمائیے)

نگار

فہرست مضامین ماہ دسمبر ۱۹۲۹ء

ملاحظات ——— ۲

مومن و کلام مومن — کیفی چریا کوٹی — ۹

گناہ کی گٹھری — (ڈاکٹر) اعظم کریوی — ۱۷

مسلمانان ہند کے پستی کے اسباب — سید مقبول احمد بی۔اے — ۲۲

خلیق اورنگ آبادی — سید تمکین کاظمی — ۲۸

مصحفی کا مرتبہ شاعری — افسر امروہی — ۳۳

سیاح کی ڈائری ——— ۵۰

ازدواج مکرر ——— ۵۷

ارہر کا کھیت — رشید احمد صدیقی ایم۔اے — ۶۵

جلوۂ کرشن — ہوش بلگرامی — ۷۰

زندگی — مجنوں گورکھپوری — ۷۵

باب الاستفسار ——— ۸۱

منظومات:

محمود شیرانی ——— ۸۹

اختر شیرانی ——— ۹۱

شمیمی بی۔اے ——— ۹۲

فراق گورکھپوری ——— ۹۴

سید علی اختر، اختر ——— ۹۵

بسم اللہ

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۱۶)	دسمبر ۱۹۲۹ء	شمارہ (۶)

ملاحظات

کون کہتا ہے انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ کیا اس لئے کہ وہ اپنی مقابل جنس سے محبت کرتا ہے، مگر یہ فطرت کی مجبوری ہے یا اپنی خواہش کی تکمیل کا اقتضار۔ کیا اس لئے کہ وہ اپنی اولاد پر شفقت و رافت صرف کرتا ہے، لیکن وحشی سے وحشی درندہ بھی اس جذبہ سے خالی نہیں کیا اس لئے کہ وہ اپنے ابنائے جنس کے ساتھ نرمی و تلطف سے کام لیتا ہی مگر شاید صرف اس لئے کہ وہ اپنے ساتھ کسی سلوک کی توقع رکھتا ہے۔ تم فطرت انسانی کا مطالعہ خواہ کسی پہلو سے کرو، اس کی خود غرضی، اس کی ناحق کوشی، اور اس کی حرص و ہوا پرستی اس کی زندگی کے ہر ہر لمحہ اور اسکے اعضار کی ہر ہر جنبش سے وابستہ پاؤگے۔ یہاں تک کہ وہ خدا کی عبادت بھی کرتا ہے تو صرف اس طمع سے کہ وہاں اس کو حوریں ملیں گی، کوثر و تسنیم ملینگے اور ہر وہ چیز ملیگی جو اس دنیا میں اُسکو میسّر نہیں آسکتی۔

عالم طفلی سے لیکر عہد انحطاط تک کوئی دور زندگی کا ایسا نہیں ہے، جس میں انسان کی اس فطری خصوصیت کی جھلک نمایاں طور پر نہ پائی جائے اور اس قدیم حیوانیت کے علامات اسمیں نظر نہ آئیں جس کا ثبوت ماہرین علم تشریح بعض اثری اعضا سے دیتے ہیں اور ڈارون، قانون ارتقار سے۔

یقیناً انسان نام نہ اس کے اعضار کا ہے، اور نہ اُن خصوصیات کا جو اس کے محض ایک جاندار چیز ہونے کے ثبوت میں پیش کیجا سکتی ہیں

بلکہ انسان کا بہترین تشخص اساسی وہ ہے جو کائنات کی سب سے زیادہ روشن و مکمل الہامی کتاب نے بتایا ہے۔

"انی جاعل فی الارض خلیفۃ"۔ وعلم آدم الاسماء کلہا اس لئے آئیے آج کی صحبت میں اجمالاً استخلاف فی الارض اور حقیقت علم پر ایک نگاہ ڈال لیں، کیونکہ میرے نزدیک تمام اخلاق کی اساس اور فلسفۂ مذہب کی بنیاد اسی پر قایم ہے۔

خلافت سے مقصود ربانی کیا ہے، اور اس خلافت کی غایت کیا ہے؟ بظاہر یہ سجث بہت طویل الذیل گفتگو کا مقتضی معلوم ہوتا ہے لیکن خدا نے جس طرح تمام فلسفۂ حیات کو نہایت آسان و مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے، اسی طرح خلافت انسانی کے مسئلہ کو بھی بہت واضح و صاف طور پر ظاہر کر دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:۔

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصٰلحٰت لیستخلفنہم فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم۔

(یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کئے ان کو زمین میں اپنا قایم مقام بنائے گا جیسا کہ اس سے قبل کے لوگوں کو عطا فرمایا گیا) نہ صرف اس آیت میں بلکہ اکثر مقام پر جہاں استخلاف کا ذکر کلام مجید میں آیا ہے اسی کے ساتھ ارض کا بھی ذکر کیا گیا ہے:۔

(۱) قال عسیٰ ربکم ان یہلک عدوکم ویستخلفکم فی الارض فینظر کیف تعلمون۔

(۲) ولو نشاء لجعلنا منکم ملٰئکۃ فی الارض یخلفون

(۳) ثم جعلناکم خلٰئف فی الارض من بعدھم لننظر کیف تعملون۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہ استخلاف، یہ خلافت اسی زمین سے متعلق ہے، اسی دنیاوی حیات سے تعلق رکھتی ہے اور اسی عالم کے کاروبار سے متعلق ہے جس کو دوسرے مقامات پر وراثت ارضی سے تعبیر کیا گیا ہے:۔

(۱) ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثہا عبادی الصالحون۔

(۲) ان الارض للہ یورثہا من یشاء من عبادہٖ والعاقبۃ للمتقین۔

(۳) وقالوا الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ واورثنا الارض نتبوأ من الجنۃ حیث نشاء۔ فنعم اجر العاملین۔

پھر کسی جگہ وراثت ارض کے ساتھ عبادی الصالحون کا ذکر ہے، کسی جگہ متقین کا بیان ہے اور کہیں عاملین کی طرف اشارہ ہے یعنی خلافت خداوندی، نیابت الٰہی یا وراثت ارضی کے حصول کا ذریعہ صرف یہی ہے کہ انسان اچھے کام کرے، ترقی کے لئے جد و جہد کرے، دنیا میں امن و سکون کو رواج دے اور اپنے استقلال و استقامت سے شیطانی قوتوں، طاغوتی لشکروں اور اخلاقی بغاوتوں کا مقابلہ کرے۔

پھر اسی کے ساتھ سورۂ احقاف کی اس آیت کو ملاحظہ فرمائیے:۔

فھل یہلک الا القوم الفاسقون (کیا سوائے فاسق قوم کے کوئی اور قوم ہلاک ہو سکتی ہے) اور غور کیجئے کہ ان تمام آیات کے مفہوم کو مربوط کرنے سے کیا نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔

پہلے ارشاد ہوا کہ "میں زمین میں اپنا قایم مقام، اپنا نائب پیدا کرنا چاہتا ہوں جس کا نام انسان ہے"۔ پھر بتایا گیا کہ خلافت سے مراد یہ ہے کہ "وہ زمین کا وارث ہو، وہاں حکومت کرے، امن و سکون پھیلائے، ترقی کی راہیں نکال کے خدا کی پیدا کی ہوئی تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھائے

رات دن محنت و عمل میں لگا رہے اور حیات دوام حاصل کرے۔ اس کے بعد فیصلہ کن الفاظ میں بتا دیا گیا کہ جب تک انسان ان باتوں پر کاربند رہے گا وہ برابر ترقی کرتا رہیگا، کیونکہ خدا کا دستور یہی ہے کہ وہ صرف ان قوموں کو ہلاک کرتا ہے جو فاسق ہیں، باغی ہیں، اور خدا کی ودیعت کی ہوئی قوتوں سے کام نہ لیکر کفران نعمت کا ارتکاب کرتی ہیں۔

یقیناً ترقی سے مراد صرف مادی ترقی نہیں ہے، محض صنعت و حرفت، دولت و تجارت، جاہ و ثروت کی ترقی مقصود نہیں ہے، لیکن اسی کے ساتھ کلام مجید سے یہ بھی ثابت نہیں کہ وراثت ارضی سے مراد نکبت و ذلت اور عسرت و افلاس ہے۔ اس لئے وہ قومیں جو اس وقت دنیاوی حیثیت سے ترقی یافتہ نظر آتی ہیں باوجود انتہائی انحطاط اخلاق کے بھی، ایک لحاظ سے اپنے آپ کو یرثہا عبادی الصالحون کے تحت میں لا سکتی ہیں، لیکن وہ جن کے پاس نہ دولت ظاہری ہے نہ دولت اخلاق اور ہلاک ہو رہی ہیں آپ نے آپ کو فھل یھلک الا القوم الفاسقون سے کیونکر علیحدہ کر سکتے ہیں۔

کیا کوئی بڑے سے بڑا مولوی، یعنے خدا کا کوئی بڑے سے بڑا خلیفہ اس کا جواب دے سکتا ہے۔

علم کی تعریف خدا نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:۔ ولا تقف ما لیس لک بہ علم۔ ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسئولا۔

یعنی ہر اس چیز کو تسلیم نہ کیا کرو جس کا تمہیں علم نہ ہو اور علم کی حقیقت اس طرح سمجھ لو کہ تمہارے کان، تمہاری آنکھ اور تمہارا قلب ان میں سے ہر ایک جواب دہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ تم کرتے ہو وہ پوری طرح سوچ سمجھ کر اطمینان نفس و قلب کے ساتھ کرتے ہو یا محض دوسروں کے کہنے سننے سے۔

یہ ہے تفسیر و تشریح علم آدم الاسماء کلھا کی۔ علم اسماء سے مراد حقایق اشیاء کا علم ہے اور علم بھی وہ جس کا ذکر اوپر کیا گیا، پھر اب انسان کے مسئلہ خلافت فی الارض اور حقیقت علم دونوں کو ملا کر غور کرو کہ اسلام کی صحیح تعلیم کیا ہے اور اسی کو معیار قرار دے کر فیصلہ کرو کہ وقت و زمانہ کے لحاظ سے ہمکو کیا کرنا چاہئے کہ کھوئی ہوئی وراثت ارض حاصل ہو سکے۔

میں نے ہمیشہ اس امر کی تبلیغ کی ہے کہ اسلام سے زیادہ وسیع النظر، قریب الفہم، آزاد خیال اور وسیع آغوش رکھنے والا مذہب کوئی نہیں ہو سکتا، اس نے کوئی چیز ایسی پیش نہیں کی جو مذہب کے دایرہ کو تنگ و محدود کر دینے والی ہے، بلکہ اس نے دوسرے مسلک والوں کے ساتھ اس رواداری کا اظہار کیا ہے جس کی نظیر دنیا کا کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا۔ اس نے دوسرے مذہب کے انبیاء و اکابر کی عزت کرنے کا درس دیا، اس نے دیگر اقوام کی کتب مقدسہ کا احترام کیا ہے۔ اس نے لکل اجل کتاب کا سبق دیا ہے، اس نے لکل قوم ھاد کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے، وہ علی الاعلان معترف ہے اس امر کا کہ وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر اور اس نے صاف صاف یہ بھی بتا دیا ہے کہ لکل امۃ رسول پھر جب حقیقت یہ ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام جو اس فراخدلی کے ساتھ تمام دنیا کو دعوت دے رہا ہے اور جو اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتا کہ تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً۔

کیوں نہیں سارے عالم پر چھا جاتا اور کیوں نہیں دنیا اس مرکز پر آ جاتی جسے اسلام نے صرف انسانیت اور اخوت عامہ سے تعبیر کیا ہے۔

اگر اس راز کی حقیقت معلوم کرنا ہے تو اسلام کی تعلیمات کو نہ دیکھو کہ وہ تو ہمیشہ سے بے لاگ ہیں، کلام مجید پر غور نہ کرو کہ اس میں بھی کوئی تبدیلی

یدا نہیں ہوئی، بلکہ صرف اس جماعت کی تاریخ کا مطالعہ کرو جو اپنے آپ کو عالم دین، ہادی طریقت، اور مرشد و رہبر کہتی ہے کہ اس نے ہمیشہ اپنے اغراض نفسانی کے لئے تعلیمات مذہب کو مسخ کر کے پیش کیا اور آج بھی عالم انسانی اس طاغوتی قوت کا مجروح نظر آتا ہے۔ وہ تمکو اس امر کی اجازت نہیں دیتا کلام مجید پر غور کرو، حالانکہ خدا نے علم و یقین کے باب میں تمہارے قلب کو بھی ذمہ دار بنا دیا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ منشاء ایزدی کو صرف اسی نے سمجھا ہے حالانکہ علم آدم اسماء کلہا میں تمام افراد نوع انسانی شامل ہیں۔ وہ تعلیم دیتا ہے کہ مسلمان بننے کے لئے صورت بدلو، لباس بدلو، خاص وضع اختیار کرو، مخصوص طریق حیات کے پابند ہو، درانحالیکہ خدا نے یہ شرط کہیں عاید نہیں کی۔ خدا مسلمانوں کو انتم الاعلون کے لقب سے یاد کرتا ہے، لیکن ان کا تقاضہ یہ ہے کہ محکوم رہو، غلام بنو، دوسروں کے دستگر بنے رہو، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مذہب کا تعلق صرف درستی اخلاق سے ہے، لیکن یہ گروہ کہتا ہے کہ مذہب نام ہے قومیت کا، سیاست کا، اور ہر اس چیز کا جس سے حقیقتاً مذہب کو کوئی تعلق نہیں ہے۔

پھر آج جبکہ اس جماعت نے ہمارے تمام نظام مذہبی کو درہم برہم کر رکھا ہے، سب سے پہلے سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان کب تک آنکھ بند کر کے انکے مواعظ و ہدایات کو وحی آسمانی سمجھتے رہیں گے اور کس حد تک وہ بانی اسلام اور اسکی توہین کو گوارا کریں گے۔ وقت آگیا ہے کہ لوگ ہوشیار ہو جائیں اور ان کے اقتدار کے ارگراں سے اپنی گردنوں کو آزاد کرلیں کیونکہ جب تک یہ "حجاب کثیف" درمیان باقی ہے، امت مسلمہ کبھی منزل مقصود تک نہیں پہونچ سکتی۔

گذشتہ ماہ کی ڈایری پر لکھنؤ کے ایک شیعی اخبار سرفراز نے ۱۲ر نومبر ۲۹ء کی اشاعت میں پورے تین کالم کا مقالہ افتتاحیہ آخر کار سپرد قلم کر ہی دیا

چشم من روشن کہ رویش بامداداں دیدہ ام

ڈایری میں صرف لکھنوی شاعری کے حقیقی عناصر سے بحث کر کے بتایا گیا تھا کہ وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے اس کو ایک مخصوص رنگ میں رنگ دیا تھا اور اسی سلسلہ میں تاریخ اودھ کے اس المناک حصہ کا بھی ذکر آگیا تھا، جس کا حوالہ بسلسلۂ تنقید ضروری تھا، لیکن ہمارے محترم معاصر نے اسے جس زاویۂ نگاہ سے دیکھا وہ کم از کم میرے لئے ضرور حیرتناک ہے۔

اگر وہ اس کے جواب میں لکھنوی شاعری کے عناصر ترکیبی سے بحث کر کے اختلاف کرتے یا تاریخی حیثیت سے تردید فرماتے تو یقیناً وہ علم و زبان کی ایک اہم خدمت ہوتی، لیکن انہوں نے شروع سے لیکر آخیر تک سارے مضمون کو فرقہ وارانہ جذبہ کا نتیجہ بتایا ہے، اور اس قدر بے اختیاری و بے صبری کے ساتھ کہ اگر میں چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ

چھائی جاتی ہے یہ دیکھو تو سراپا کس پر؟

میں دنیا کے ہر الزام کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو سکتا ہوں، لیکن عصبیت، نفاق انگیزی یا دل آزاری کا الزام میرے اوپر قایم کرنا بالکل ایسا ہے جیسے میں اڈیٹر سرفراز کو سنی کہدوں کہ وہ یہ سنکر سوائے ہنسنے کے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

جو حضرات نگار کا مطالعہ کرتے رہے ہیں وہ آگاہ ہیں کہ مذہب کے باب میں میرا نظریہ اس قدر وسیع ہے کہ وہاں کافر و مسلم کے سوال کی بھی گنجایش نہیں ہے

چہ جائیکہ شیعہ سنّی اور اس لئے اگر میری کسی ادبی یا تاریخی تنقید میں کوئی شخص عصبیت کی بو پاتا ہے تو میں بلا تامل کہدوں گا کہ یہ اس کے مشام کی گمراہی ہے، جس کا نقص ہے۔

اسی نگار میں خود میں نے اپنے قلم سے مذہب اہل سنّت کے بہت سے مروجہ عقاید و مسایل پر نہایت سخت تنقیدیں کی ہیں اور کرتا رہتا ہوں جہاں تک مراسم مذہب کا تعلق ہے یا رواجی دنیا سے اسے واسطہ ہے، میں اس وقت تشیّع و تسنّن کیا ہر مذہب کو مجموعۂ خرافات پاتا ہوں اور میں اس کے اظہار میں تامل نہیں کرتا، اور کوئی صاحب ادراک انسان انکار نہیں کرسکتا کہ اسوقت دنیا مذہب کے صحیح اصول سے کس قدر ہٹی ہوئی ہے، مثلاً میں خود سرفراز کے قابل اڈیٹر سے دریافت کرتا ہوں کہ نوابان اودھ کے دربار میں مذہب کے نام سے جو جو بدعتیں روا رکھی جاتی تھیں کیا واقعی مذہب تشیّع انہیں جایز سمجھتا ہے۔ وہ تو وہ مجھے معلوم ہے کہ سنجیدہ علمار شیعہ عزاداری کی اس صورت کو بھی جو فی الحال عام طور پر رائج ہے کبھی پسند نہیں کرتے۔ سلطنت اودھ میں جو کچھ ہوا وہ اخلاقی نقطۂ نظر سے یقیناً گندگی و عفونت ہی کہلائے گا، اور اگر بجائے شیعہ سلطنت کوئی سنّی حکومت ہوتی تو میں اسوقت بھی اسے انہیں الفاظ سے یاد کرتا۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ منصور کے باب میں اورنگزیب پر میں نے ایسی سخت تنقید کی ہے کہ شاید ہی آپ کو کسی دوسری جگہ ملے۔ یا جہاں تک انصاف کا تعلق ہے میں نے معاویہ و حسین کے کردار کا فرق دکھانے میں جس صفائی سے کام لیا ہے وہ غالباً آپ کے لئے بھی حیرتناک ہو۔ میں اس معاملہ میں اپنے آپ کو اسقدر بے لاگ پاتا ہوں کہ اگر آج میں شیعہ عقاید کا متبع ہو جاؤں تو بھی میری تنقید کا لب و لہجہ یہی ہوگا، بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ سخت۔ میں جماعتی تفریق یا مذہبی امتیاز کو سامنے رکھ کر کبھی کچھ نہیں لکھتا بلکہ ہمیشہ اخلاق و انسانیت کو سامنے رکھ کر تنقید کرتا ہوں، خواہ وہ مسئلہ حضرات شیعہ کا ہو یا اہل سنت کا۔

اب رہا لکھنوی شاعری، یا سلطنت اودھ کی بنیاد کا سوال، سو میں بہت ممنون ہونگا اگر اڈیٹر سرفراز کوئی تفصیلی جواب اس کا پیش کریں گے، کیونکہ ممکن ہے خود انہیں کی طرف سے بہت سے ثبوت ایسے فراہم ہو جائیں، جنکو میں نے قصداً نظر انداز کر دیا تھا، اسی سلسلہ میں انہوں نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ وہ "دربار خلافت کی ان رنگ رلیوں کا بھی ایک ہلکا سا فوٹو دکھانے کے لئے مجبور ہوں جو تقدس کے پردہ میں جایز رکھی گئی تھیں"۔ اہلاً و سہلاً ضرور ایسا کیجئے بلکہ اگر آپ دربار رسالت میں کوئی نقص محسوس کرتے ہیں تو اس کا بھی اظہار کیجئے۔ آپ کی اس تنقید پر سب سے پہلا مبارکباد دینے والا شخص اڈیٹر نگار ہوگا اگر واقعی وہ کوئی تاریخی خدمت ہوئی۔

ہمارے عزیز دوست اور ملک کے نہایت کہن سال صحافی جناب جالب نے، میرے اس مضمون سے اختلاف کرتے ہوئے جو گذشتہ ماہ نگار میں "استفسار" "ہندو مسلم اتحاد" پر لکھا گیا تھا، ایک مقالۂ افتتاحیہ تحریر فرمایا ہے جو ۲۴ اور ۲۷ نومبر کے ہمت میں شایع ہوا ہے۔

جناب جالب کے اس ناقدانہ مضمون پر چند در چند پہلوؤں سے بحث کی جاسکتی ہے اور بعض نہایت اہم اصولی مسائل معرض گفتگو میں آسکتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ملاحظات میں بالتفصیل اس بحث کو نہیں چھیڑ سکتا اور نہ غالباً اس امر کی ضرورت ہے کہ اب جب ہندوستان کے سیاسیات "نظریہ" کی دنیا سے ہٹ کر "عملی" پہلو اختیار کر رہے ہیں خواہ مخواہ ان مباحث میں بیکار وقت ضائع کیا جائے، لیکن میں اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ نہ جناب جالب صاحب میرے مدعا کو سمجھے اور نہ میں ان کی تنقید کو، جالب صاحب

...تے ہیں کہ مسلمانوں میں وطنی جذبہ کام کر رہا ہے اور میں یہی چیز مسلمانوں میں نہیں پاتا۔ ان کے یہاں اگر کوئی صحیح یا نادرست جذبہ ہے تو وہ مذہبی جذبہ ہے، اور وہ اسی کے ماتحت اپنی قومیت و وطنیت کو قایم کرنا چاہتے ہیں، جو میرے نزدیک بدترین سیاسی گمراہی ہے۔ جب تک قوم کے سیاسیات اس کے مذہب سے علیحدہ نہ ہوں گے نہ اس میں وطنیت پیدا ہو سکتی ہے اور نہ وہ حکومت میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ خیال کی بنا پر میں نے لکھا تھا کہ مسلمانوں کا مستقبل مجھے بہت تاریک نظر آتا ہے لیکن اگر جالب صاحب کے نزدیک حقیقت یہ نہیں ہے (وہ کبھی ثابت نہیں کر سکتے) تو میں کیا ساری دنیا ان کی ہمنوا ہو سکتی ہے۔

دوسری سب سے بڑی غلطی جالب صاحب نے یہ کی ہے کہ وہ ہندوستان کو ہر عسکری قوت کے سامنے جھکنے پر مجبور پاتے ہیں اور ثبوت میں انگریزوں ...یش کرتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے مٹھی بھر جماعت سے ہندوستان کو فتح کیا اور اب تک اس پر حکومت کر رہے ہیں۔ جناب جالب کو معلوم ...ونا چاہئے کہ ہندوستان انگریزوں نے کبھی فتح نہیں کیا بلکہ خود ہندوستانیوں نے انگریزوں کے لئے کیا۔ یعنی جس وقت تک ہندوستانیوں ...یں جذبہ وطنیت پیدا نہیں ہوا تھا وہ دوسرے کے لئے آلہ کار بنکر خود اپنا نقصان کرنے میں جری تھے۔ لیکن اب جبکہ یہ جذبہ پیدا ہو گیا ہے ...ب صاحب اس امید موہوم پر کوئی ایسی تعمیر قایم نہیں کر سکتے جسے وہ مسلمانوں کا قبلۂ مقصود یا کعبۂ امن و امان قرار دیں۔ کیونکہ اگر مسلمانو... ہندوؤں سے علیحدہ ہو کر محض انگریزوں کی تتبع میں "جس کی تیغ اس کی دیگ" پر عمل کیا تو اس کا نتیجہ سوائے ناکامی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا ...اب زمانہ وہ نہیں ہے جو کلایو کو ملا تھا، بلکہ وہ ہے جب ایک نہرو رپورٹ کے مطالبہ کی تردید بھی حکومت کے بس کی بات نہیں۔ مجھے حیرت ...جالب صاحب نے حکومت کی تقسیم یونانی و اسلامی تو سمجھ لی لیکن اس طرف خیال منتقل نہ ہوا کہ آج ہندوستان میں جس حکومت کا مطالبہ ...وہ نہ یونانی ہوگی نہ اسلامی بلکہ خالص ہندوستانی اور وہ جو اپنے آپ کو ہندوستانی نہ سمجھے گا اس کی برکات سے یقیناً محروم رہیگا۔

آپ اپنے لئے جداگانہ انتخاب چاہتے ہیں، آپ اپنے لئے علیحدہ قانون طلب کرتے ہیں، آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی اقلیت اکثر کی حیثیت ...کرے، لیکن اہلیت و قابلیت کا یہ عالم ہے کہ اگر یہ سب کچھ دیدیا جائے تو بھی ایک مست کی پگڑی کی طرح اس کا سنبھالنا دشوار ... پہلے مسلمانوں سے اس ذہنیت کو دور کر دیجئے جو باجہ اور رام لیلا پر آمادۂ جنگ ہو جاتی ہے اور علم الدین کو (جو یقیناً قتل کا مجرم تھا ...س کو بالکل بجا طور پر پھانسی دی گئی)، شہید قوم سمجھ کر اس کی قبر کو زیارت گاہ بنا لیتی ہے، اس کے بعد آپ مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق ...امید افزا پیشین گوئی فرمائیے گا، اور پھر یوں بھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر آپ کو مسلمانوں کا مستقبل موجودہ حالات کے ماتحت بھی بہت ...ں نظر آتا ہے، تو پھر آپ نہرو رپورٹ سے کس اندیشہ کی بناء پر اختلاف فرما رہے ہیں۔ کیا بقول آپ کے مسلمانوں کی اقلیت دو لاکھ مسلح ...ی نہیں نکال سکتی ہے کہ ہندوؤں کو مفتوح کر کے حکومت برطانیہ کی سنّت کو پھر از سر نو زندہ کر دے۔

بر تمنا ہائے عرفی خندہ می آید مرا

یہ رسالہ سولھویں جلد کا آخری پرچہ ہے اور جنوری سنہ ۳۰ء کے رسالہ سے سترھویں جلد شروع ہوگی، ۲۹ء کے پروگرام کا جزو غالب ...ی مضامین تھے اور تنقید سے جو ہیجان پیدا ہو سکتا ہے، وہ ملک میں پیدا ہوا اور بالکل بجا۔ لیکن الحمدللہ نگار و صاحب نگار دونوں کا

ضمیر مطمئن ہے کہ اس نے ذاتیات یا عصبیت کو کہیں دخل نہیں پانے دیا اور اگر کسی نے اس کے خلاف رائے قایم کی تو اس کی ذمہ دار خود اس کی قوت فیصلہ ہے۔

سنہ ۳۰ء کا پروگرام کیا ہوگا؟ اس کے متعلق قبل سے کوئی بیان دینا مناسب نہیں۔ مستقبل خود بتائے گا کہ ہمارا لائحۂ عمل کیا تھا اور ہم کس حد تک اسمیں کامیاب ہوئے۔ و افوض امری الی اللہ۔

اس رسالہ کے ساتھ اکثر حضرات کا چندہ ختم ہوتا ہے۔ اس لئے مینجر کی طرف سے جو اعلان صفحہ ۸۰ پر شایع ہوا ہے اس کو ایک بار ضرور دیکھ لیجئے۔ میں ان حضرات کو جو ہمیشہ شروع سال سے جدید خریدار پیدا کرکے مجھ پر کرم فرمانے کے عادی ہیں، ان کو بھی خصوصیت سے توجہ دلاتا ہوں۔ ایک مطبوعہ کارڈ اس رسالہ کے اندر آپ حضرات کو ملیگا، براہ کرم اس کی خانہ پُری کرکے آخر دسمبر ۲۹ء تک دفتر نگار میں بھیجدیجئے۔ یہ التجا مینجر کی نہیں ہے، بلکہ میری درخواست ہے جس کو اگر آپ مطالبہ بھی سمجھیں تو نادرست نہیں ہو سکتا۔ اگر نگار کی خدمت کو کسی قابل سمجھتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس کی توسیع اشاعت میں حصہ نہ لیں جبکہ آپ کو اپنے حلقہ احباب میں صرف دو خریدار جدید فراہم کردینا چنداں دشوار نہیں ہے۔

گذشتہ ماہ کے رسالہ میں ایک فسانہ جناب طالب باغپتی کا جھوٹ کے عنوان سے شایع ہوا ہے، یہ فسانہ لیونڈ اینڈریو کے فسانہ کا ترجمہ ہے۔ کاتب کی غلطی سے اس کا اظہار اختتام مضمون پر نہ ہو سکا۔

ماہ جنوری سنہ ۳۰ء کا رسالہ ظفر اور اس کی شاعری کے لئے مخصوص ہے، اس وقت تک جتنے مضامین موصول ہوئے ہیں انمیں اس کی شاعری سے بحث نہیں کی گئی، لیکن اس عہد کے بعض تاریخی و معاشری حالات سے متعلق دو مضمون (ایک جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب اور دوسرا سید وزیر حسین صاحب دہلوی کا) ایسے پاکیزہ موصول ہوئے ہیں کہ اگر ظفر نمبر میں سوائے ان دو مقالوں کے اور کوئی تیسرا مضمون نہ ہوتا تو بھی کافی سے زیادہ سامان دلچسپی فراہم ہو جاتا۔ لیکن آپ دیکھینگے کہ ۱۰۰ صفحات میں علاوہ ان دو مضامین کے اور بھی جو کچھ درج ہوگا وہ آپ اپنی نظیر ہوگا۔

ہمارے پاس انڈین میڈیکل اسٹور نظیر آباد لکھنؤ سے ایک شیشی سرمہ کی آئی تھی جس کو ہم نے خود بھی استعمال کیا اور اپنے بعض احباب کو بھی دیا۔ تجربہ سے یہ سرمہ بہت مفید ثابت ہوا ہے اور آنکھوں کے بہت سے امراض کیلئے کارآمد چیز ہے۔ اگر کوئی عیب ہے تو یہ کہ سفید ممکن ہے جدید خیال کے حضرات اس کو بھی خوبی میں شمار کریں۔

نیاز

مومن وکلام مومن

(بہ سلسلہ سابق)

خصوصیات شعر

ابو الہلال عسکری امام بلاغت اپنی مشہور کتاب "صناعتین" مین لکھتے ہین کہ "کلام نثر ہو یا نظم اس مین سہولت - سلاست - بہتر الفاظ، عمدہ معانی اچھی ترکیب - موزون نشست الفاظ ہونا ضروری ہے"

شعر کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ "شعر کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جو معانی کثیرہ پر حاوی ہون، جن کو سنکر سننے والا خود بخود لطف حاصل کرے، سہل ہو، قلیل النظیر ہو

امام یحییٰ بن علی یمنی نے اس مسئلہ پر طویل بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ناظم اور ناثر کو علوم ضرور یہ پیش نظر رکھ کر کلام کو مرتب کرنا چاہئے یعنی کہاں مبتدا کو ہونا چاہیے کہاں خبر کو، کہاں مقدم ہونا ضروری ہے کہاں موخر، اسی طرح جملہ فعلیہ مین یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ فاعل کہاں ہونا چاہئے اور مفعول کی کون جگہ ہے، کس قسم کا فعل لانا مناسب ہے ضمائر میں بھی مناسبت اور عدم مناسبت کا پیش نظر رکھنا لازم ہے، منشائے بیان یہ ہے کہ اگر اشعار قواعد مقررہ (نحویہ وعرفیہ)، کے مطابق ہیں تو اس قابل ہیں کہ سندیں پیش کیے جائیں، ان کی صحت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔

جہاں یہ امر مسلم ہے وہیں یہ بھی مان لینا پڑے گا کہ اس قسم کے اشعار آمد کے درد اور بیساختگی کے نشتر بن نہیں سکتے۔ یہ بہت مشکل ہے کہ کوئی شخص ان قیود کے ساتھ آمد کا رنگ پیدا کرے۔ اگر ایسا کوئی شاعر نظر آئے تو اس کے اشعار زور تخیل کا نتیجہ نہوں گے بلکہ کرامت کی دلیل۔

حکیم مومن، اسی قسم کے شاعر ہیں کہ پابندیوں کے اندر وہ اس طرح آزاد ہیں کہ نظر کو دھوکا ہوتا ہے، یہی سبب ہے کہ اعتراض کرنے والے اعتراض کرتے ہیں لیکن ان کو اس کی صحت اور عدم صحت کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

علامہ قلقشندی صبح الاعشیٰ کی جلد دوم میں صفحہ ۲۷۴ پر خصوصیات شعر کے متعلق نہایت محقق اور دلچسپ بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

شعر کی خوبی کے سات مدارج ہیں:-

۱- کسی شعر کا ہر مصرع بجائے خود مستقل ہو، مثلاً امرئ القیس کا شعر ہے:-

افاطم مہلا بعض ھذا التدلل
وان کنت قد ازمعت ھجری فاجمل

اس شعر کا ہر مصرعہ اپنی جگہ پر مستقل ہے۔ شعر کا یہ درجۂ اعلیٰ ہے۔

۲۔ دونوں مصرعے مستقل بھی ہوں اور ایک دوسرے سے مربوط بھی ہوں، مثلاً امرئ القیس کا یہ شعر۔

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل

بسقط اللوی بین الدخول فحومل

اس شعر کا پہلا مصرعہ بجائے خود مستقل ہے، لیکن جب دوسرا مصرعہ ملا دیا گیا تو اسکا درجہ بڑھ گیا۔

۳۔ شاعر اپنے کسی شعر کے دونوں مصرعوں کو جس جگہ چاہے رکھدے لیکن معنی میں فرق نہ آسکے۔ اس کا نام تصریع موجہ ہے مثلاً ابن حجاج کا یہ شعر:۔

من شروط الصبوح فی المرجان

خفة الشرب مع خلو المکان

۴۔ پہلا مصرعہ غیر مستقل ہو لیکن جب دوسرا مصرعہ ملا یا جائے تو شعر پورا ہو جائے، اسکا نام تصریع ناقص ہے۔ متنبی کا شعر ہے:۔

مغانی الشعب طیباً فی المغانی

بمنزلة الربیع من الزمان

۵۔ شعر میں کوئی لفظ وسط اور قافیہ میں بہ طریق حقیقت واقع ہو جیسے:۔

وکل ذی غیبة یؤب

وغائب الموت لا یؤب

اس میں لفظ یوب تصریع کر رہے ہے۔

کبھی بہ طریق مجاز ہوتی ہے، مثلاً:۔

فتیً کان شرباً للعفاة و مرتعاً

فاصبح للهندية البیض مرتعاً

اس شعر میں لفظ "مرتعاً" مجاز ہے۔

۶۔ پہلا مصرعہ اسوقت تک معلق رہے جب تک دوسرے مصرعہ کا پہلا لفظ اسکی صفت بنا کر نہ ملایا جائے۔ مثلاً:۔

الا ایہا اللیل الطویل الا انجلی

بصبح وما الاصباح منک بامثل

پہلا مصرعہ لفظ "بصبح" کا محتاج ہے، اسکو تصریع معلق کہتے ہیں۔

۷۔ مختلف القافیہ مصرعوں کے نام کو تصریع مشطور کہتے ہیں، مثلاً:۔

اقلنی قد ندمت علی الذنوب
وبالاقدار غدت من المجود

اس شعر میں ذنوب کا قافیہ مجود لایا گیا ہے جو معیوب ہے۔

مومن اور خصوصیات شعر

اسی کسوٹی پر "مومن" کے اشعار دیکھنا چاہئیے، مومن کے تمام دیوان میں زیادہ تر اول و دوم مدارج کے اشعار ہیں، سوم و چہارم کے کم، پنجم و ششم کے اس سے کم۔ ہفتم کا نشان نہیں۔

(مثال اول و دوم)

(۱)

غضب سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیری خواہش ہے
نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاق جنت کا

پہلا مصرعہ بجائے خود مستقل ہے لیکن دوسرا ملا دیا گیا تو ارتباط بڑھ گیا۔

(۲)

اظہار شوق شکوہ اثر اس سے تھا عبث
میں نے کہا کہ مرتے میں تم پر کہا عبث

اس شعر کا پہلا مصرعہ اس قدر مستقل ہے کہ دوسرا نہ بھی ملایا جائے تب بھی مضمون میں کوئی نقص نہیں رہتا۔

(۳)

تصریع ناقص کی مثال:۔

خبر نہیں کہ اسے کیا ہوا پر اس در پر
نشان پا نظر آتا ہے نامہ بر کا سا

(۴)

نہ جاؤں گا کبھی جنت کو میں نہ جاؤں گا
اگر نہ ہووے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا

اس شعر میں تصریع موجود ہے یعنی پہلا مصرعہ دوسرے کی جگہ اور دوسرا پہلے کی جگہ رکھ دیا جائے تو مقصود میں فرق نہ ہو۔ مرتبۂ پنجم محتاط اور قادر الکلام شعراء کے نزدیک عیب سمجھا جاتا ہے، اس لئے "مومن" نے اس سے حتی الوسع احتراز کیا ہے۔

الفاظ اور شعرا

ناظم اور ناثر کی قدرت اور فضیلت نظم اور نثر میں الفاظ اور معانی کی موزونیت سے معلوم ہوتی ہے۔ ابن رشیق قیروانی العمدہ صفحہ ۸۰ جلد اول میں لکھتے ہیں کہ:۔

"لفظ جسم اور معنی روح ہے ان دونوں میں باہم ارتباط ایسا ہوتا ہے جیسا جسم اور روح میں، جس طرح جسم کی قوت سے روح قوی اور ضعف سے ضعیف ہوتی ہے، یہی حال الفاظ کا ہے، معنے اگر درست ہوتے ہیں اور لفظ میں نقص ہوتا ہے تو شعر میں نقص پیدا ہوجاتا ہے، اگر معنے میں خرابی ہے تو لفظ بیکار معلوم ہوتا ہے"

اسی کتاب میں آگے چلکر معانی اور الفاظ کے موازنے میں "الفاظ" کی خرابی و صحت زیادہ زور دیا ہے:۔

"اکثر ائمہ لغت خوبی الفاظ کو معانی پر ترجیح دیتے ہیں، بعض علماء کا قول ہے کہ الفاظ، معانی سے زیادہ ضروری اور قیمتی ہوتے ہیں ابو ہلال عسکری اس فن کے جید امام کا قول ہے کہ "معانی کی تمام خوبیاں الفاظ پر موقوف ہیں، یہی وجہ ہے کہ شعرا اور خطباء اپنے کلام میں اثر پیدا کرنے کے لئے مناسب الفاظ کی ترتیب دیتے ہیں"، (صفحہ ۴۲ کتاب صناعتین)

علامہ قلقشندی کی رائے ہے کہ:۔

"شیریں الفاظ کی طرف طبیعت خود بخود مائل ہوتی ہے نہ کہ معانی کی طرف"

کلام فصیح کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"فصاحت کا انحصار الفاظ پر ہے، یعنے لفظ فصیح وہ ہے جس کے فوراً سمجھنے میں کسی قسم کے اہتمام کی ضرورت نہ ہو۔

پھر لکھتے ہیں کہ:۔

الفاظ میں خاص قسم کی کشش ہوتی ہے جس کی طرف قوت سامعہ کا خود بخود میلان ہوتا ہے، اگر الفاظ میں سختی ہوتی ہے تو اس سے نفرت پیدا ہوتی ہے اول الذکر کی مثال آواز بلبل اور دوسرے کی مثال گدھے کی آواز ہے"

اس پر اگر یہ اعتراض کیا جائے اس قسم کی نفرت یا رغبت کا انحصار الفاظ پر نہیں بلکہ آواز پر ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ آواز الفاظ کی تابع ہوتی ہے، یعنے کوئی آواز لفظ یا الفاظ سے خالی نہیں ہوتی۔

ہماری رائے میں الفاظ صرف سامعہ نواز ہی نہیں ہوتے بلکہ ان سے قوت باصرہ، دل و دماغ سب کو کیفیت و لذت حاصل ہوتی ہے۔

(مثال الفاظ فصیح)

مومن نے اپنے اشعار میں اس کا کہاں تک اہتمام کیا ہے، ذیل کے شعروں سے معلوم ہوسکتا ہے:۔

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا
دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

اس شعر میں الفاظ دیدۂ حیراں۔ تماشا۔ دیکھا کیا کی فصاحت قابل ذکر ہے، اس شعر میں ان سے زیادہ موزوں الفاظ کا اجتماع مشکل ہے۔ یا اس مضمون یا ان معانی کو دوسرے الفاظ میں ڈھالنے سے یہ خوبی ساقط ہوجاتی ہے۔

(۲)

تیرے پردے نے کی یہ پردہ دری
تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

اس شعر کے الفاظ خط کشیدہ کو معیار مذکورہ پر جانچ کر دیکھئے۔

(۳)

تلخ کامی پر مجھے، تجکو لب شیریں پہ ناز
آمرے جادو سے اعجاز مسیحائی ملا

اس شعر میں الفاظ تلخ کامی۔ لب شیریں۔ جادو۔ اعجاز مسیحائی کے کرشمے دیکھئے۔

(۴)

الجھاتے ہی اغیار نکل آتے ہیں باہر
زنجیر در یار ہے سلسلہ اپنا

اس شعر میں لفظ سلسلہ نے شعر کو شعر بنا دیا ہے۔

معانی اور شعر

صبح الاعشی میں ہے کہ "معانی" کا وجود الفاظ کے لئے ایسا ہے جیساکہ جسم کے لئے لباس ہوتا ہے جس طرح جسم کپڑے کا تابع ہوتا ہے اسی طرح الفاظ معانی کے تابع ہوتے ہیں۔ صاحب بلاغت کو الفاظ سے زیادہ معانی کے اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے۔

معانی کی چند صورتیں ہوتی ہیں:-

۱۔ مستقیم حسن ــــ یہ صورت وہ ہوتی ہے کہ اپنی صحت پر خود دلالت کرتی ہے۔ اسکی مثال عربی میں رایت زیداً ہے اور اردو میں "میںنے زید کو دیکھا" ہے، اس قسم کے اہتمام کا نام "سحر حلال" ہے

۲۔ مستقیم قبیح ہے، اس کی مثال عربی میں "زیداً رایت" "زید کو دیکھا میں نے" اس کا دوسرا نام تعقید ہے ابن اثیر نے مثل السائر میں اس کا نام مغالطۂ معنویہ رکھا ہے۔

۳۔ مستقیم کاذب ــــ اس کی مثال "حملت الجبل" "میں نے پہاڑ اٹھالیا حقیقتاً غلط ہے لیکن اپنے موقعہ پر مبالغہ موزوں ہے۔

۴۔ مستقیم محال ــــ ان باتوں کا ذکر جو عقلاً اور عادۃً محال ہوں۔ اس کا دوسرا نام غلو ہے۔ یہ بھی اپنے موقعہ پر مستحسن اور موزوں ہے۔ بشرطیکہ شاعر کا دماغ صحیح ہو اور اس میں کافی تمیز ہو، ورنہ معیوب ہے مثلاً اردو کا یہ شعر:-

ایک دن رونے جو بیٹھا میں برائے امتحان
سو سمندر ساتھ نالے، کتنے دریا بہہ گئے

۵۔ مستقیم غلط۔ اس کی مثال عربی میں یہ ہے کہ کوئی کہے "ضرب بنی زایدٌ" مجھ کو زید نے مارا، لیکن منشاء ہو "ضرب زیداً" میں نے زید کو مارا، یہ بھی اپنے موقع پر درست ہوتا ہے بشرطیکہ شاعر اس موقعہ کو سمجھے۔

"مومن" نے ان اقسام کو جس طرح پیش نظر رکھا ہے انکی مثالیں دیکھ لیجئے:۔

مثال اول :۔ سے

اس کوچہ کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی
کوئی تو دل کی آہ پر نکھا سا جھل گیا

اس شعر میں "سلاست" کی خوبی جہاں تک ہے ارباب نظر پر مخفی نہیں۔

مثال دوم :۔ سے

ایسی لذت خلش دل میں کہاں ہوتی ہے
رہ گیا سینہ میں اسکا کوئی پیکاں ہوگا

اس شعر میں تعقید ضرور ہے لیکن "معیوب" نہیں، اہل فن سمجھ سکتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار بہت کم بلکہ الشاذ کالمعدوم ہیں لیکن ان کا "عیب" مومن نے اپنی حکمت سے نکال دیا ہے۔

مثال سوئم :۔ سے

مر گئے اس کے لب جاں بخش پر
ہم نے علاج آپ ہی اپنا کیا

اس شعر کا "کذب" صدق استعارہ وتشبیہ کے انداز رکھتا ہے، شاعر کا یہ کمال قابل ذکر ہے۔

مثال چہارم :۔ سے

یہ مشت پر سوختہ پھونکیں گے قفس کو
تو ساتھ کسی کے مجھے صیاد نہ کر بند

"مومن" کے اس محال میں امکان کی بیباختگی دیکھئے۔

مثال پنجم :۔ سے

نام وصال لینے سے ہوتا ہے مضطرب
کیونکر کہوں اسے مرے مرنے کا غم نہیں

لفظ "وصال" سے کذب میں صدق کا جلوہ موجود ہے، مومن نے اس قسم کا کمال اپنے دیوان میں کثر جگہ دکھایا ہے۔

ترتیب اور شعر

اہتمام الفاظ و معانی سے زیادہ "ترتیب" کا خیال شعر کو بہتر اور شاعر کے کمال کو ظاہر کرتا ہے۔ جو شاعر جس قدر صاحب کمال ہوتا ہے، اسی قدر اس کے اشعار کی ترتیب بہتر ہوتی ہے۔

فصیح اور بلیغ الفاظ استعمال بھی کئے جائیں لیکن انکی ترتیب درست نہو تو ان کی فصاحت اور بلاغت بیکار ہوتی ہے۔ مفرد الفاظ عام طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن الفاظ ترتیب اور ترکیب سے دلکش اور دلگداز بن جاتے ہیں۔

ائمہ معانی و بیان کی رائے ہے کہ قرآن حکیم اپنی ترتیب لفاظ کی وجہ سے معجزہ ہے۔

آیات:- وقیل یا ارض ابلعی ماءك ویا سماء اقلعی وغیض الماء وقضی الامر واستوت علی الجودی الخ سنکر ایک عرب نے اس کی فصاحت و بلاغت پر سجدہ کیا تھا، حالانکہ الفاظ ارض - سماء - امر - ماء دہی ہیں جو روزانہ بولے جاتے ہیں۔ لیکن ترتیب میں آکر معجزہ بن گئے۔

ترتیب میں حسب ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

۱- ضعفِ تالیف نہو، مثلاً "ضرب غلامہٗ زیداً" (مارا اس کے غلام نے زید کو، اسمیں ضعفِ تالیف ہے۔

۲- تعقید نہ ہو۔ (اسکی مثال بیان ہوچکی ہے)

۳- تنافر کلمات نہ ہو مثلاً (ولیس قرب قبر حرب قبر) اسکی دوسری مثال آچکی ہے۔

شمس الدین محمد بن قیس رازی نے ان خصوصیات پر ایک فیصلہ کن محقق مضمون لکھا ہے، اسکا خلاصہ دیکھئے اور اس معیار پر "مومن" کو جانچئے۔

"کوئی شخص اس وقت تک شاعر کہے جانے کا مستحق نہیں جب تک ادوات شعر سے واقف نہو کلمات صحیح، الفاظ شیریں، عبارات بلیغ، معانی لطیف سے اپنے شعر کو آراستہ کرنا نہ جانتا ہو، وزن مناسب، ردیف اور قافیہ کی خوبی اور موزونیت سے آگاہ نہ ہو۔"

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:-

شاعر کو اس جوہری کے مانند ہونا چاہئے، جو جذب نظر خریدار ان کے لئے اپنے جواہرات کو مناسب اور موزوں مواقع پر رکھتا ہے، شاعر کو بھی شعر میں مناسب لفاظ کو موزوں جگہ رکھکر اپنے صحت مذاق کا ثبوت دینا چاہئے۔

اس موضوع پر نہایت شرح و بسط کیساتھ جمیع اصناف پر اس کتاب میں لطیف بحث ہے اس جگہ صرف اسی پر اکتفا کرنا مناسب سمجھا گیا۔

"مومن" دنیائے شاعری میں میر، کے بعد پہلے شخص ہیں جو الفاظ کو شعر میں نگینے کی طرح جڑتے ہیں اور اس فن میں موزونیت اور مناسبت کا ایسا کمال دکھاتے ہیں جو نظروں کو خیرہ کر دیتا ہے۔

اگر اس خصوصیت کا اضافہ کر لیجئے کہ تمام اصناف معانی و بیان سے اپنے پورے دیوان کو سجایا ہے تو ان کی اس قدرت میں ان کا شریک کوئی شاعر نہیں۔

پہلے بتایا گیا ہے کہ "شاعر" اپنے فضل وکمال، طبیعت، وقت، فضا، گرد وپیش، رنگِ زمانہ سے متاثر ہوتا ہے، اور وقت و زمانہ شاعر کو متاثر کر کے اپنی زبان بنالیتا ہے۔ اس لئے شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ اس کی زبان نہیں ہوتی بلکہ زمانے کی۔ ہومر اپنے وقت کے یونانیوں کی زبان تھا اور ڈمینٹ اور ملٹن کا بھی یہی حال تھا

حکیم "مومن" بھی اپنے وقت اور زمانے کے واقعات اور فضا سے متاثر ہوئے ہیں، لیکن اپنی خودداری کے حدود سے آگے نہیں بڑھے، اور شعرا کی طرح زمانے نے ان سے بھی موافقت نہیں کی ہے لیکن وہ اس سے پریشان اور مضطرب ہو کر متانت سے کبھی آگے نہیں بڑھے، ضروریات نے ان کو بھی مجبور کیا ہے، لیکن کبھی اپنے اشعار کے موتیوں کو بازار میں لے کر نہیں گئے۔

باقی ——— باقی

"کیفی چریاکوٹی"

نوٹس

ہندوستانی اکاڈمی صوبہ متحدہ الہ آباد کے مطبوعات

ازمنہ وسطیٰ میں ہندوستان کے معاشرتی و اقتصادی حالات ———

از علامہ عبداللہ یوسف علی۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ ایم۔ سی۔ جی۔ ای ———

مجلد	۴؏
غیر مجلد	۳؏

زیر طبع

(۱) مغلوں سے پہلے عرب وہند کے تعلقات (از مولانا سید سلیمان صاحب ندوی)

(۲) مسلمانوں کے تمدن پر ہندوؤں کا اثر (از مولانا محمد امین صاحب عباسی)

(۳) ازمنہ وسطےٰ کا ہندوستانی تمدن (از رائے بہادر مہامہوپادھیا گوری شنکر ہیراچند صاحب اوجھا)

(۴) ہندی شاعری (از ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی)

جنرل سکریٹری ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد

گناہ کی گٹھری

(فسانہ)

اسکا پورا نام بسنت رام تھا، لیکن گاؤں کے سب لوگ اس کو بسنتا کہتے تھے۔ چچا چچی کے سوا اس دنیا میں بسنتا کا کوئی عزیز اور نہ تھا۔ پھر بھی گاؤں والوں نے اس کو اپنا بنا لیا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ بسنتا گاؤں والوں کا تو کام کر دیتا تھا لیکن اپنے گھر کی وہ کوئی پرواہ بھی نہ کرتا تھا۔ گاؤں بھر کے بیگار کرنے میں بسنتا کا خوب جی لگتا تھا وہ کھیتی باڑی کے کام میں خوب ہوشیار تھا لیکن اس سے اس کے چچا کو کوئی مدد نہ ملتی تھی، بسنتا کو گھر کے کام میں لگانے کے لئے اس کے چچا کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔

ادھر ادھر کی بیگار کر کے جب بسنتا اپنے گھر میں گھستا اور ہنس ہنس کر اپنی چچی سے کھانا مانگتا تو وہ بہت خفا ہوتی۔

بسنتا کے سرپرست صرف بسنتا ہی پر نہیں خفا ہوتے بلکہ وہ اپنے پڑوسیوں کو بھی دو چار الٹی سیدھی سنانے سے باز نہ آتے تھے، خصوصاً جگوا کو تو وہ اٹھتے بیٹھتے گالیاں دیتے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ تھا کہ جگوا ہی نے بسنتا کو کچھ "دوا دارو" کھلا کر اپنے بس میں کر لیا ہے۔

بوڑھا جگناتھ (جگوا) ذات کا مالی تھا اس کے پاس دو چار بیگھے موروثی کاشتکاری تھی، اسی میں اس کی بخوبی بسر اوقات ہو جاتی تھی گھر میں وہ اور اس کی نواسی "سکھیا" کے سوا اور کوئی نہ رہتا تھا، اس کا ایک ناتی "جھنوا" جوان ہوتے ہوئے بھی اپنے بوڑھے نانا کی کوئی مدد نہ کرتا تھا، بلکہ وہ اِدھر اُدھر آوارہ مزاج لڑکوں کے ساتھ مارا مارا پھرا کرتا، جب کبھی اس کو خرچ کی ضرورت ہوتی تو وہ دو چار دن کے لئے گھر آ کر اپنے نانا کو تنگ کیا کرتا۔

(۲)

برکھا رت اور دوپہر کا وقت تھا، رم جھم رم جھم پانی برس رہا تھا، بوڑھا جگوا اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھا ہوا دھان کوٹ رہا تھا اور اس کے قریب ہی سکھیا کوٹے ہوئے دھان کو پھٹک رہی تھی۔ سکھیا کی عمر زیادہ سے زیادہ بارہ برس کی رہی ہوگی پھر بھی وہ گھر کے کام کاج میں بڑی ہوشیار تھی۔ پانی برستے ہی میں بسنتا نے جگوا کو آ کر پرنام کیا اور سکھیا سے کہا۔ "سکھیا! "کلی" کہاں ہے، ذرا اٹھا تو لا میں نانا کو تمبا کو پلا دوں"۔

بسنت، جگو کو نانا کہتا تھا، دونوں حقہ پینے کے بڑے شوقین تھے۔ بسنتا چلم پر چلم بھرے جاتا اور اس کے بدلے میں بوڑھا جگو اپنی جوانی کے واقعات اور غدر کے قصے سنایا کرتا، اس وجہ سے ان دونوں میں بڑی دوستی تھی۔

سکھیا نے "کلی" لا کر بسنتا کو دیدی، چلم میں تمبا کو جما اور آگ رکھ کر بسنتا نے "کلی" جگو کی طرف بڑھا کر کہا۔ "لو نانا تم

ذرا دم لگالو میں دھان کوٹے دیتا ہوں"۔

سکھیا نے بسنتا کی طرف غور سے دیکھا اور کہا۔"بھیّا کیا آج تم نے روٹی نہیں کھائی ؟"

سکھیا کے اس سوال سے بسنتا سٹ پٹا گیا اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا لیکن اس کے پژمردہ چہرہ سے یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ سکھیا کا خیال درست ہے۔ جگو نے حقہ کا ایک کش لیکر کہا۔"ارے! ابتک نہیں کھایا۔ سکھیا تو کیسے جان گئی میں تو بوڑھا ہوگیا ہوں اب مجھے کچھ نہیں سوجھتا" بوڑھے کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلکنے لگے

سکھیا اسی وقت بسنتا کے لئے کھانا لائی، بسنتا نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔"سکھیا تو نے ہی یہ کھانا پکایا ہے"۔

سکھیا نے لجاکر جواب دیا۔"ہاں"

"واہ! واہ!! تُو تو بڑا مزیدار کھانا پکاتی ہے"

"معلوم ہوگیا تم ہنسی میں ایسا کہہ رہے ہو۔ ترکاری خراب ہوگی"

"تیری قسم ترکاری تو بہت اچھی ہے۔ میری "چاچی" بھی اس سے اچھا نہیں پکا سکتی"

"کیا "چاچی" بہت اچھا کھانا پکاتی ہے ؟"

"لیکن تجھ سے اچھا نہیں"

"چاچی" کا ذکر ہوتے ہی سکھیا نے پوچھا۔"بھیّا یہ تو بتاؤ آج تم نے گھر میں کھانا کیوں نہیں کھایا، کیا "چاچی" کچھ خفا تھیں ؟"

بسنتا نے اداس ہوکر جواب دیا۔"چاچا" نے کھیت پر جانے کو کہا تھا، میں نہیں گیا اسی سے "چاچی" بہت خفا ہوگئیں"

"تم نے "چاچی" اور "چاچا" کا کہنا کیوں نہیں مانا ؟"

"میں کھیت پر جانے کے لئے تیار تھا لیکن اسی وقت مودائی کے گھر سے ایک آدمی مجھے بلانے آیا اور میں کھیت پر نہ جاسکا"

"چاچا" کا کام چھوڑ کر تم مودا کے یہاں کیوں گئے"۔

"مودا کے یہاں میرا جانا بہت ضروری تھا کیونکہ اس کے یہاں کے سب لوگ بخار میں پڑے ہیں، کوئی پانی دینے والا بھی نہیں "چاچا" کا کام کرنے والے بہت ہیں، میرے نہ جانے سے ان کا کچھ حرج نہیں ہوسکتا"۔

سکھیا اور بسنتا کی یہ باتیں جگو اپنی بڑے دھیان سے سن رہا تھا، اس نے دل میں کچھ سوچکر ایک ٹھنڈی سانس لی وہ بہت دیر تک کچھ سوچتا رہا اور جب بسنتا کھانا کھاکر اس کے پاس پہونچا تو اس نے کہا۔"بیٹا ایک بات کہوں مانو گے"

"تا تا تمہاری بات نہ مانوں گا تو پھر کس کی مانوں گا"۔

بوڑھے نے کلی بسنتا کی طرف بڑھا کر کہا۔"اچھا سن۔" بوڑھے کو کھانسی آگئی، اس نے کھنکھار کر پھر کہا۔"بسنتا تو اپنا دل نہ چھوٹا کر میرے ہی گھر میں رہا کر۔ میں اپنی سکھیا سے تیرا بیاہ کردوں گا اور میرے پاس جو دو چار بیگھے زمین ہے وہ بھی تیرے نام لکھ دوں گا مٹھی بھر اناج کے لئے چچا کی گالیاں کون سنتا ہے"۔

بسنتا نے دانتوں سے اپنی زبان دبا کر کہا :- ''نانا یہ تم کیسی بات کہہ رہے ہو، تمہارا جو کچھ ہے وہ سب ''چنوا'' کا ہے، کھیت مکان سب پر اسی کا حق ہے، میں اس کا حق چھین کر نرک میں نہ جاؤں گا۔ رام! رام!! یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ رہ گیا بیاہ کا معاملہ تو میں اس سے دور بھاگتا ہوں، میں بیاہ کروں گا ہی نہیں''

بوڑھے نے مایوس ہو کر کہا۔ ''یہ کیوں؟''

بسنتا نے دھان کوٹتے ہوئے جواب دیا۔ ''نانا تم بوڑھے ہو کر بھی اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے، بات یہ ہے کہ بیاہ ہوتے ہی میں تم کو پرایا سمجھنے لگوں گا۔ یہی میرے چچا پہلے مجھ کو بہت پیار کرتے تھے، لیکن جب سے ان کا بیاہ ہوا، اور ''چاچی'' آئیں تب سے ـــــ اور کیا کہوں ـــــ کچھ ڈر نہ ہو تو مجھے کچا ہی کھا جائیں۔

(۳)

اسی دن شام کو ''چنوا'' اپنے نانا کے یہاں آیا، وہ گانجہ پیئے ہوئے تھا، اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، کرپارام بنیا تیہ لگا کر ''چنوا'' سے اپنے روپیوں کا تقاضا کرنے آیا، پانچ برس ہوئے ''چنوا'' نے اس سے کچھ روپیے ادھار لئے تھے، لیکن ابتک دینے کا نام نہ لیتا تھا۔ کرپارام آج ذرا تیز ہو کر آیا تھا، اُدھر ''چنوا'' بھی گانجہ کے نشہ میں خوب گرم ہو رہا تھا، کرپارام نے سختی کی تو چنوا نے بگڑ کر کہا :-

''ابے! بجو کی سی آنکھیں کیوں نکالتا ہے، تیرے ایسے بنیوں کو میں سمجھتا ہی کیا ہوں، یہاں سے اپنا منھ کالا کر، میں روپیے نہیں دوں گا، جا نالش کر دے''

کرپارام نے چنوا کو یونہی روپے دیدیئے تھے، کچھ ''لکھا پڑھی'' نہ کی تھی نالش کرنے سے اس کو کچھ فائدہ حاصل ہونے کی امید نہ تھی۔ اس نے کہا :- ''سارا غنڈا پن نکال دوں گا، دے گا کیسے نہیں، کیا مفت کے روپیئے تھے۔ تو کیا میں تو تیرے باپ سے لیلوں گا۔''

نشہ میں چور ''چنوا'' نے اس زور کی لات کرپارام کے جگر پر ماری کہ وہ دھم سے زمین پر بے سدہ ہو کر گر پڑا، اس کے گرتے ہی چنوا کا نشہ ہرن ہو گیا، دوڑ کر پانی لایا اور کرپارام کے منھ پر چھڑکنے لگا، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا، اس کے قریب ہی سکھیا کھڑی ہوئی کانپ رہی تھی۔ اور بوڑھا جگوا بخار میں کراہ رہا تھا۔ بہت کوشش کرنے پر بھی جب کرپارام کو ہوش نہ آیا تو چنوا کا ڈر کے مارے برا حال ہو گیا، اس نے بہت آہستہ سے سکھیا سے کہا۔ ''ہائے اب کیا ہو گا؟ یہ تو مر گیا'' خوش قسمتی سے چنوا کا مکان بستی کے ایک سرے پر تھا اس کے قریب کوئی مکان نہ تھا، ورنہ چنوا اور کرپارام کی گالی گلوج پر بہت سے لوگ جمع ہو جاتے۔ بہن اور بھائی جب دونوں نا امید ہو کر دعائیں مانگ رہے تھے تو انہیں کچھ آہٹ معلوم ہوئی، آواز پہچانی ہوئی معلوم ہوئی، کسی نے کہا :- ''اری سکھیا کیا اب تک گھر میں دیا نہیں جلا، نانا کو بخار چڑھ آیا کیا؟'' سکھیا نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر کہا۔ ''بھیا شور نہ مچاؤ آہستہ آہستہ بولو بہت بڑی مصیبت آگئی۔ بسنتا نے گھبرا کے کہا :- ''کیسی مصیبت؟ باہر کون لمبا لمبا پڑا ہے''

سکھیا نے بسنتا کے منھ پر ہاتھ رکھکر کہا :- ''چپ! چپ!!'' یہ کہکر سکھیا نے چپکے چپکے سب حال کہدیا۔ چنوا نے بسنتا کے دونوں پاؤں پکڑ لئے اور کہا :- ''بسنتا اب تو ہی بچا''

سکھیا نے بھی سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ "بھیا جس طرح سے بھی ہو میرے بھائی کی جان بچا لو"

بسنتا نے کچھ دیر سوچ کر کہا:- "ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہیں سب ٹھیک کر لوں گا، اچھا یہ تو بتا کہ گھر میں کوئی بوری یا تھیلا ہے؟"

سکھیا نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا:- "ہاں ہے"

"اچھا تو جلدی لے آ"

بسنتا اور چنوا نے مل کر کریارام کی لاش کو بوری میں بند کیا اور یہ طے پایا کہ جب سب لوگ سو جائیں اور گاؤں میں سناٹا ہو جائے تو بسنتا اس بوری کو ندی میں ڈال آئے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آدھی رات کے وقت بسنتا کریارام کی لاش کو اپنی پیٹھ پر لاد کر ندی کی طرف چل پڑا، اس کے جاتے ہی چنوا خود کو اپنے دل میں پاپی سمجھنے لگا۔

بسنتا کہہ گیا تھا کہ وہ لاش کو ندی میں ڈال کر رات ہی کو "چنوا" کے گھر آ جائے گا، مگر دن نکل آیا اور وہ واپس نہ ہوا۔ "چنوا" کو بسنتا سے زیادہ اپنی فکر تھی کہ اگر کہیں بسنتا گرفتار ہوا تو "چنوا" کی خیر نہیں۔ دس بجے دن کے جب اس کو پتہ چلا کہ پولیس نے بسنتا کو کریارام کے قتل کرنے کے جرم میں گرفتار کیا تو "چنوا" کا منھ فق ہو گیا، وہ سوچنے لگا:- "ایک دن مرنا تو ہے ہی پھر اپنی جان کے لئے بسنتا کو کیوں پھنساؤں۔ —— تھانہ میں چلکر سچی بات کہہ دوں —— لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟" یہ سوچکر چنوا کانپ اٹھا۔ بوڑھے جگوا کو تو یقین نہ آتا تھا کہ بسنتا نے کریارام کا خون کیا ہوگا، سکھیا کی عجیب حالت تھی۔ اس کا دل بیٹھا جاتا تھا، بھائی کی محبت میں وہ اپنے نانا سے بھی سچی بات نہ کہہ سکی۔ ادھر جب اسے ناکردہ گناہ بسنتا کا دھیان آتا تو وہ کلیجہ تھام کر رہ جاتی۔ "چنوا" اب گھر سے بہت کم باہر نکلتا تھا، وہ دن بھر ایک گوشہ میں چپ چاپ پڑا کچھ سوچا کرتا۔ جس دن بسنتا کا مقدمہ عدالت میں پیش ہونے والا تھا، اس دن "چنوا" کی حالت غیر ہو گئی، سکھیا نے اس کا حال پریشان دیکھ کر کہا "آج تمہارا منھ کیوں اترا ہوا ہے خیریت تو ہے؟"

چنوا نے بہن کی طرف مجرمانہ نظر سے دیکھ کر کہا "مجھے کیا ہو گیا ہے؟ —— تو کیا سمجھ سکتی ہے سکھیا!"

(۴)

جس دن بسنتا کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو "چنوا" بھی وہاں موجود تھا، اس کو دیکھ کر بسنتا کا دل دھڑکنے لگا، ابھی مقدمہ کی کارروائی شروع نہ ہوئی تھی کہ چنوا ایک بارگی مجسٹریٹ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا:- "حضور! بسنتا بڑا بدھ سب آدمی ہے یہ میرے گناہ کی گٹھڑی چرا لایا ہے، اصلی مجرم میں ہوں، کریارام مجھ سے اپنے روپیوں کا تقاضا کرنے آیا تھا اسے مجھے گالی گلوج کی میں گانجہ پئے بیٹھا تھا مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس کے پیٹ پر ایک لات جما دی اور وہ بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا، میں نے اس کے منھ پر پانی چھڑکا کہ اسے ہوش آ جائے لیکن اسکو تو مجھے سزا دلانا تھا جان بوجھکر مر گیا، اس کے بعد یہ چور بسنتا میرے گھر آیا اور اس نے کہا کہ میں لاش کو ندی میں پھینک آؤں گا، میں راضی ہو گیا، اور میں نے لاش کو بوری میں بند کر کے اس کی پیٹھ پر باندھ دی۔ حضور اب تو آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا یہ بسنتا بڑا بدھ سب آدمی ہے مجھ کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔ کیوں بسنتا ٹھیک ہے نا!" یہ کہکر چنوا نے بسنتا کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

مقدمہ پھر نئے سرے سے شروع ہوا "چنوا" سیشن سپرد کیا گیا اور بسنتا کو اخفائے جرم کی پاداش میں ۱½ سال قید سخت کی سزا ملی سیشن میں مقدمہ خراب ہو گیا اور چنوا سزائے موت سے بچ گیا۔

۱½ سال کی سزا کاٹ کر جب بسنتا رہا ہوا تو وہ سیدھا اپنے جگوا نانا کے پاس پہونچا، چنوا کے متعلق اُس نے اس سے کچھ نہ دریافت کیا، کیونکہ اس نے سمجھ لیا تھا کہ چنوا کو ضرور پھانسی ہو گئی ہوگی۔

بسنتا نے منھ لٹکا کر غمگین لہجہ میں جگوا سے کہا "نانا! اس کی تقدیر!!"

بوڑھے نے جواب دیا "ہاں اس نے جوانمردوں کا سا کام کیا ہے، مگر تو تو بتا کہ تو نے مفت میں کیوں اپنی جان جوکھوں میں ڈالی تجھے اتنی تکلیف اٹھانے کی بالکل ضرورت نہ تھی"

بسنتا نے روتے ہوئے کہا: "نہ میری ماں ہے نہ باپ۔ مرجاؤں تو کوئی رونے والا بھی نہیں ہے، اگر مجھے پھانسی ہو جاتی تو بہت اچھا ہوتا ——"

بوڑھے نے بسنتا کو جھڑک کر کہا: — "جب تیرا ایسا خیال ہے تو آج سے مجھے "نانا" مت کہنا۔ کیا ہم لوگ تیرے کوئی نہیں کیوں رے بسنتا؟"

سکھیا چلم بھر رہی تھی، اس نے ہنس کی طرح گردن موڑی اور بسنتا پر تیز نگاہ سے حملہ کر کے بولی "اب چپ چاپ کیوں کھڑے ہو جواب کیوں نہیں دیتے کیا ہم تمہارے کوئی نہیں ہیں؟"

بسنتا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں وہ نانا کے گلے سے لپٹ کر رونے لگا۔ بوڑھے نے بسنتا کو اپنے کلیجہ سے لگا لیا، ایک ہفتہ کے اندر ہی اچھی ساعت میں بوڑھے جگوا نے سکھیا کے ساتھ بسنتا کا بیاہ کر دیا، بسنتا پھر شادی کرنے سے انکار نہ کر سکا۔

اعظم کریوی (ماخوذ از بنگالی)

تصویر زیب النساء بیگم

جو دربار عالمگیری کی ایک بے مثل مصورہ کی قلمکار ہے، اور بعد تنقید و تحقیق بسیار اس کی صحت کی توثیق ہو چکی ہے، یہ تصویر تین خوشنما رنگ سے تیار کی گئی ہے اور ۱۹۲۸ء کے نگار میں شایع ہو چکی ہے قیمت مع محصول ...... (۸/)

تصویر رقاصہ

بنگال کے مشہور نقاش و مصور مزدار کی ایک بہترین تصویر جو حضرت نیاز کے مشہور مضمون رقاصہ کے گجراتی ترجمہ کے ساتھ کلکتہ کے مشہور گجراتی رسالہ نوجیتن میں شایع ہوئی تھی۔ قیمت ..... (۴/)

"منیجر نگار لکھنؤ"

مُسلمانانِ ہند کی پستی کے اسباب

اور

مذہب و قوم کی غلط تعبیر

حکومتِ ہند کی ایجوکیشنل کمشنر کی رپورٹ سنہ ۱۹۲۲ء تا سنہ ۱۹۲۷ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانانِ ہند میں تعلیم کی پستی کے خاص اسباب مندرجہ ذیل ہیں :۔

"دیگر اقوام کے لڑکوں کی نسبت مسلمان مذہبی قیود کے باعث تعلیم میں اکثر پیچھے رہ جاتے ہیں۔ انکو نہ صرف ۷ برس کے عرصہ تک محض قرآن شریف کی تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے بلکہ اس کے بعد چند سال انکو اپنے صوبجات کی مروجہ زبانیں سیکھنے میں صرف کرنے پڑتے ہیں۔ اس طرح ان کو چھوٹی عمر میں تین زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں۔ مذہبی زبان یعنی عربی یا فارسی اور بعض اوقات دونوں۔ اردو زبان اور اس کے بعد ضلع کی مروجہ زبان جو کچھ بھی ہو۔ اور اگر وہ آگے تعلیم جاری رکھتے ہیں تو انکو زبان انگریزی بھی پڑھنی ہوتی ہے۔ گویا چار بلکہ پانچ زبانوں کیطرف پوری توجہ کرنی پڑتی ہے۔ برخلاف اس کے ہندوؤں کو کافی سہولتیں حاصل ہیں۔ اول تو انکو اپنی آبائی زبان یعنے سنسکرت سیکھنی نہیں پڑتی۔ دوم ضلع کی زبان وہ آغوشِ مادری ہی میں سیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہوش سنبھالنے پر انکو صرف دو زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں، ایک ورنیکولر دوسری انگریزی۔ ان زبانوں کو بھی یہ ہندو لڑکے اس وجہ سے نہیں سیکھتے کہ یہ ان کی زندگی میں کار آمد ثابت ہو، بلکہ وہ دماغ اور حافظہ کی تربیت کیلئے سیکھتے ہیں غالباً ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابیں سنسکرت ہی میں ہیں، لیکن ان کے لئے سنسکرت پڑھنا لازمی امر نہیں ہے۔ انکے مذہبی کتب کا زیادہ حصہ ورنیکولر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور ہندو زیادہ تر انہی ترجموں سے ضروری واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ پھر کیوں نہ مسلمان طلبہ کو بھی مذہبی تعلیم عام فہم زبان میں دی جائے۔ اب مسلمانانِ ہند کو اپنی تعلیمی کانفرنسوں میں اس سوال پر ضرور غور کرنا چاہیئے۔ لیکن جس قدر توجہ اس اہم سوال کی جانب کرنی چاہیئے اس قدر ابتک نہیں کی گئی۔ لیکن باوجود ان تمام رکاوٹوں اور پابندیوں کے مسلم طلبہ کی تعداد میں سنہ ۱۹۱۷ء و سنہ ۱۹۲۲ء کے درمیان پیشتر کی بہ نسبت ۱۴۲۰۰۰ کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اور سنہ ۱۹۲۲ء و سنہ ۱۹۲۷ء کے درمیان ان کی تعداد میں ۸۵۰۰۰ کی زیادتی ہوئی۔ اگرچہ مسلمان لڑکوں کو قرآن شریف کی تعلیم دینا از حد مفید ہے۔ لیکن بلا مطلب و معانی سمجھائے ہوئے رٹانے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ بہترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ انکو مذہبی باتیں عام فہم زبان میں سمجھا دی جائیں۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ کل اضافہ شدہ طلبہ کی تعداد میں ۳۰ فیصدی تعداد مسلمان لڑکوں کی ہے۔ صوبجات متحدہ میں پرائمری و سکنڈری اسکولوں میں تعلیم پانے والے مسلمان طلبہ کی تعداد میں صرف ۵۲۰۰۰ کا اضافہ ہوا ہے"۔......

قابلِ غور امر یہ ہے کہ یہ مذہبی قیود "از ماست" کہ "بر ماست" تو نہیں۔ غالباً اس بات سے کسی ذی فہم کو انکار نہ ہوگا کہ اگر عموماً

ہندوستان وخصوصاً بنگال میں ہندو مسلمانوں کا تناسب سوائے جیل خانوں، قحبہ خانوں، غریب خانوں کے کہیں بھی آبادی کے لحاظ سے نہیں یا ہندوستان میں کسی علمی و سیاسی و تمدنی زندگی میں ہمارا کما ینبغی حصہ نہیں تو اس کی اصل وجہ ہماری تعلیمی پستی ہے۔ اور در حقیقت تعلیم کا فقدان ہی قومی زوال کی انتہا ہے۔ جس کا مظاہرہ افغانستان کے واقعات میں ہمارے سامنے ہو رہا ہے۔ پس تعلیمی پستی کا سبب بجز اس کے کچھ نہیں کہ ہم دنیا میں یا تو ایک ایسے نرالے مذہب کے پابند ہیں جو ہمکو ترقی کے میدان میں جانے نہیں دیتا یا خود ہم نے اس مذہب کو نرالے طریقہ سے اختیار کیا ہے۔ اور وہی ہماری پستی کا سبب ہے۔

جنہوں نے فلسفۂ مذہب کا مطالعہ نگار میں کیا ہے۔ ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ میرا مقصد اس کتاب کے لکھنے سے نہ یہ تھا کہ اصحابِ تقویٰ سے مبارز طلبی کی جائے۔ اور نہ یہ کہ اربابِ نظر و فلسفہ سے داد حاصل کی جائے۔ میرا مقصد سوائے اس کے اور کوئی نہ تھا کہ میں اپنے ہم مذہب لوگوں کو ایکبار پھر اپنی موجودہ حالت پر جائزہ لینے کے لئے آمادہ کر سکوں۔ اور اس کے بعد ان سے اجازت اس بات کی لوں کہ اپنے مذہبی مطامحِ نظر میں زمانہ کے موافق ترمیم کر لیں۔ چونکہ دل مجروح و بے قرار تھا، اور میں نے اسلامی بدبختی کے شیطان کو پکڑ لیا تھا اس لئے اگر ما گرم الفاظ قلم سے نکلتے چلے گئے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک شخص اندھیری رات میں اپنے مکان کو جلتا ہوا دیکھ لے یا کسی نقب زن کو پکڑ لے تو اس وقت وہ اصطلاحی الفاظ کا دھیان نہیں کرتا اور حالتِ اضطراب میں نہ جانے کیا کیا زبان سے نکل جاتا ہے۔ تو مذہب و تمدن کا وہ شیطان کون ہے جو مسلمانوں کا رہزن ہے۔ کیا اس کی ضرورت ہے کہ قارئین کرام کو اپنی کتاب کے "مذہب اور قومیت" والے حصہ پر توجہ دلاؤں۔ یا میں پھر اس مضمون میں اس کا لب لباب پیش کروں، یا اب عملی کارروائی پر متوجہ ہوں۔ بہر حال ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پہلے اس بات کو طے کر لیں کہ مسلمان کوئی قوم ہے یا ایک مذہب۔ اگر کوئی قوم ہے تو پھر ہندوستان و چین و جزائر بحرِ ہند و افریقہ و روس میں ہماری درماندگی کا علاج بقراط کے بھی سمجھ میں نہ آئے گا۔ یہودی قوم ایک مختصر سی قوم ہے۔ مگر وہ بھی جب تک اپنی ہمسایہ قوموں سے مل کر ایک نہ ہو گئی، ترقی کے زینے پر قدم نہ رکھ سکی۔ ہماری قوم تو ماشاء اللہ ایک خمس ربع مسکون کی آبادی کے لگ بھگ ہے اور وہ لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں، انکو علیحدہ قومی حیثیت دے کر ترقی پر لگانا صرف انہیں ممالک میں ممکن ہو سکتا ہے جہاں ہم اپنی قسمت کے خود مالک ہوں، مگر جن ممالک میں ہم اپنی قسمت کے خود مالک ہیں وہ قوم کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے، باقی ۹/۱۰ حصہ دوسروں کے اختیار میں ہے۔ جہاں ہماری بے دست و پائی عیاں ہے۔ اور جہاں ہمارے پاس کوئی ایسے ذرائع نہیں جن سے ہم اپنی قوم کو مدارجِ ترقی پر پہونچا سکیں۔ پھر آئیے سب سے پہلے قومیت کو سمجھ لیں۔

قوم کی تعریف یہ ہے کہ انسان کی ایک جماعت۔ ایک زبان۔ ایک معاشرت۔ ایک قانون و شریعت۔ ایک روایت کی متبع ہو۔ مگر یہ ضرور نہیں کہ وہ ایک مذہب بھی رکھے۔ قومیں عموماً اپنے ملکوں سے نسبت رکھتی ہیں۔ مگر بعض قومیں جن کا کوئی ملک نہیں ہوتا وہ بجائے ملک کے مذہب سے اپنی نسبت کرتی ہیں۔ جیسے یہود و پارسی۔ سکھ۔ جین۔ ہندو وغیرہ۔ اور جب مذہب کو قوم سے نسبت دیجاتی ہے تو اس کے معنے ظاہر ہیں کہ اپنے مذہب کے اندر وہ تمام خصوصیتیں پیدا کر لیتی ہے۔ جو قوم کے شرائط میں داخل ہے۔ مثلاً ایک ہی لباس۔ معاشرت۔ تمدن۔ زبان۔ روایت اور رفتہ رفتہ مذہب ان ساری باتوں پر حاوی ہو جاتا ہے، اگر ایسی قوم کسی ملک کی مالک ہوئی تو مذہب

کے اندر سیاست بھی داخل ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر اس قوم کا کوئی ملک نہیں تو سیاست کا جز و معطل ہو جاتا ہے۔ قومی مذاہب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس پر عمومیت کا اطلاق قائم نہیں رہتا۔ اور چونکہ قوم صرف ایک ہی قانون سے گھٹتی بڑھتی ہے۔ یعنی توالد و تناسل سے اس لئے مذہبی جماعت کا بڑھنا بھی موقوف ہو جاتا ہے الا توالد و تناسل کے اصول سے یا ایک غیر معمولی قوت جاذبہ سے یعنی وہ دوسری ہمسایہ قوموں کی روایت و زبان کو مٹانے پر قادر ہو اور اس کو اپنے میں جذب کرے۔ اب مذہب اسلام کو اس نظر سے دیکھنا چاہئے۔ سب سے پہلے مسلمانان عالم کا ایک مختصر خاکہ یہاں دے دینا چاہئے کہ وہ کس طرح دنیا میں پھیلا ہوا ہے اور کتنی مختلف قوموں سے اس کی جماعت بنی ہے۔

۱۔ قوم عرب یا مستعرب۔ ۵۹ ملین

یمنی ۲ ملین — حجازی ۱ ملین — شامی ۴ ملین — عراقی ۵ ملین — نجدی ۳ ملین — عمانی ۲ ملین۔ مصری ۱۵ ملین — بربری ۲۰ ملین — حضرمی ۲ ملین — عرب ماورائے ممالک عربیہ (افریقہ و امریکہ و جزائر) ۵ ملین

۲۔ قوم ترک ۔ ۴۷ ملین

عثمانی ۱۴ ملین — ترکمان ۲ ملین — اوزبک ۶ ملین — تاجیک ۳ ملین — کرغیز ۵ ملین — باشکر ۴ ملین تاتار روس و قریم و قفقاس ۱۰ ملین۔ ۸۔ ترکان چین و پارقند ۲ ملین۔ ۹۔ ترک ماورائے ممالک (بلقان مصر و شام وغیرہ) ۱ ملین

۳۔ قوم عجم ۔ ۲۴ ملین

ایرانی ۱۲ ملین — افغان ۷ ملین۔ کیرد ۴ ملین — بلوچ ۱ ملین — عجم ماورائے ممالک مثل قفقاس ہندوستان افریقہ وغیرہ ۱۷ ملین۔

۴۔ قوم ہند ۔ ۶۹ ملین

پنجابی ۱۲ ملین — سندھی ۳ ملین — کشمیری ۲ ملین — بنگالی ۲۵ ملین — ہندوستانی ۱۷ ملین — دکھنی ۷، ۱ ملین اورائے ہند (افریقہ و جزائر) ۱ ملین۔

۵۔ قوم چین ۔ ۵۰ ملین

تنگان ۳۰ ملین — پانتھے دھونی ھونی ۱۸ ملین — ماورائے چین (ملایا۔ امریکہ) ۲ ملین

۶۔ قوم سلاو ۔ ۱۰ ملین

۱۔ روس و پولینڈ ۴ ملین — بلقان ۶ ملین۔

۷۔ قوم یونان ۱½ ملین

البانوی ۱ ملین — اہل کریٹ و یونان و سمرنا ½ ملین۔

۸۔ قوم ملایا ۴۲ ملین — سماترا ۱۳ ملین — جاوا ۲۰ ملین — ملکس و سیلبز ۴ ملین — ملاکا ۱ ملین — فلیپائن و

دیاپوا، ۱ ملین۔ بورنیو۔ ۴ ملین، ماورائے ملایا (جنوبی افریقہ۔ میڈگاسکر وغیرہ) ½ ملین۔

۹۔ اقوام یورپ و امریکہ و اسٹریا، ۱ ملین۔

۱۰۔ اقوام افریقہ، ۵۰ ملین:۔

حبشی ۳ ملین ــــ سودانی ۴۵ ملین ــــ سواحلی ۲ ملین

تو اسلام اس وقت ۱۰ اقوام عظیم میں شایع ہے۔ کیا یہ سب ایک ہی قوم ہیں۔ اگر نہیں ہیں اور یقیناً نہیں ہیں تو ہم ہندوستانیوں میں کون طرۂ امتیاز ہے کہ وہ یہاں آ کر ایک مسلمان کی قوم بن جائے۔ حتے کہ بڑے سے بڑا جوشیلا مسلمان ہائے قوم وائے قوم کرتا ہے، تو اس سے اس کی مراد صرف اپنے ہم مذہب والوں سے ہوتی ہے۔ سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ مذہب اسلام کو ہندوستان میں قوم بنانے کی بدعت کہاں سے نکلی۔ اور اس کے بعد ہم یہ دیکھینگے کہ قوم بننے کی رفتار کیسی ہے، آیا یہ قوم تیار ہو چکی ہے یا ابھی تیاری پر ہے۔ اور قوم بن کر وہ کہانتک قومی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوئی۔ پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ اس قومیت نے کتنے موانع مذہب و معاشرت کے متعلق ہم میں پیدا کر دیئے ہیں۔ اور پھر اس غلط عقیدہ کے ازالہ کی صورت کیا ہے۔

اسلام کو قومیت کا رنگ دینے کے جراثیم قرآن سے باہر فقہ اور حدیث میں ملتے ہیں۔ اور چونکہ مسلمانوں میں قرآن ایک ہوا بنکر رہگیا ہے۔ جس کا چھونا تک مشکل ہے۔ نہ کہ اسکا پڑھنا اور سمجھنا، اس لئے ہمارے مذہب کا سارا دارومدار فقہ و حدیث پر ہے اور یہیں سے ہماری ساری خرابیوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ عرب کا قومی عروج ایک عرصہ تک اشاعت اسلام کا مرادف سمجھا جاتا رہا۔ عربوں کے مفتوحہ ممالک کے باہر اسلام کی اشاعت کا کبھی خیال پیدا نہیں ہوا۔ اور مفتوحہ ممالک میں غیر عربی قوم میں اسلام محض معاشرتی سیاسی جاذبیت کا نتیجہ رہا۔ فقہائے اسلام کے نزدیک دنیا دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک دارالاسلام اور دوسری دارالحرب۔ اور جب فقہا کا یہ قول ہے کہ دارالحرب میں اشاعت اسلام کیا معنی یہاں تک جائز نہیں تو ہمکو خوانخواہ اس بات کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ مذہب اسلام واقعی ایک عربی پولیٹیکل مذہب تھا۔ اور اس پر عمومیت کا اطلاق کبھی نہیں ہوا۔ اور اس لئے اس کی اشاعت اسلامی سلطنت سے باہر نہیں کی گئی اور نہ ہونا چاہیئے۔ دارالاسلام کے اندر قومی خصوصیت کے سارے اجزا طبعی طور سے مذہب کے اندر ہی رہے، اور جس کو ہم معاشرت، شریعت، سیاست سے تعبیر کرتے ہیں اور جس کو مذہب سے علیحدہ جگہ دیتے ہیں وہ محض مذہب کی شاخیں ہیں۔ مگر یہ حالت دیر تک قایم نہ رہی اس لئے کہ یہ صورتیں قرآن کی عمومیت اور تبلیغ کے منشار کے خلاف تھیں۔ اور اس کو سوائے خدائی مصلحت کے اور کیا کہا جائے کہ عربوں سے سلطنت چھین لیگئی یہ ایک ایسا تازیانہ غیبی تھا کہ اب مسلمان اگر ہوش سنبھالتے تو قرآن کے مبلغ بنکر دنیا کی قوموں میں نکل جاتے اور پیغام الٰہی کو دنیا کے کونے کونے میں پہونچا دیتے۔ مغلوں کا زمانہ شروع ہوتا تھا کہ گویا عربوں کو یہ پرانا عہد یاد پڑ گیا اور یا کم سے کم ان کے موالی تبلیغ اسلام کیطرف متوجہ ہوئے۔ اور اس زمانے سے لیکر ابتک اور خصوصاً چودھویں صدی عیسوی میں تبلیغ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی جماعت خود فاتح تاتاریوں میں جزائر اوقیانوس۔ افریقہ۔ روس و چین کے اندر پیدا ہو گئی۔ حسن اتفاق یا سوئے اتفاق سے غیر عربی جماعتیں جو اسلام لائیں وہ حکمراں سے لیکر رعایا تک سب کی سب ایمان لائیں۔ ایسا نہوا کہ کسی ملک میں تھوڑے سے اصلی باشندے مسلمان ہو گئے ہوں۔ اور باقی غیر مسلم

اور جہاں ایسی حالت پیدا ہوئی، جیسے ساحل چین و ملیبار میں وہاں وہ غیر ملکی اور علیحدہ قومی حیثیت رکھتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسکی ضرورت ابھی تک محسوس نہ ہوئی کہ مذہب کو معاشرت و معالات سیاست سے جدا کیا جائے۔ یعنی مختصر یہ کہ فقہ و اجتہاد کا عروج باقی رہا، اور مذہب قوم میں کوئی ما بہ الامتیاز بات پیدا نہ ہوئی۔ انیسویں صدی شروع ہوتے ہی مسلمانوں کی سلطنت پر زوال آنا شروع ہوا۔ ہندوستان اور ملایا اور افریقہ میں اہل فرنگ نے قبضہ کیا۔ تاتاریوں کی سلطنت پر روس کا قبضہ ہوگیا۔ ایک طرف اگر یہ ہوا تو دوسری طرف چین کے اصلی آبادی میں اسلام نے معتد بہ اضافہ کرلیا۔ یہ غالباً ایسی خدائی مصلحت کے ماتحت شروع ہوا۔ اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہونچی کہ مسلمانوں کی بڑی جماعت غیر مذہب والوں کی حکومت میں آگئی۔ اس حالت کو ڈیڑھ سے برس سے زیادہ نہیں ہوا اور یقیناً یہ بہت تھوڑا زمانہ ہے کہ مسلمان غور کرسکیں کہ ایسی حالت میں انکو کیا کرنا چاہئے۔ وہ ابھی تک ہاتھ پر ہاتھ دھوے بیٹھے ہوئے ہیں اور چونکہ ابھی تک ان پر دیسی حکومت کا خمار باقی ہے جو مذہب اور سیاست کو یکساں سمجھ رہا تھا وہ اپنی قوم اپنے مذہب ہی کو سمجھ رہے ہیں۔ مگر اب رفتہ رفتہ شاید یہ محسوس کر رہے ہیں کہ سیاست پر ان کا قابو نہیں رہا۔ اس کا حصہ مذہب سے نکالنا ہی پڑے گا۔ معاشرت کے بعض قوانین کو جس میں غیر ملکی حکومت دخل دینا نہیں چاہتی، مذہبی چیز سمجھ لیا گیا۔ یعنی وراثت، شادی طلاق کے معاملات میں جسکو پرسنل لا یعنی شخصی قانون کے نام سے قایم رکھا گیا ہے۔ لیکن درحقیقت جب اسلام نام ہے صرف عمومی مذہب کا تو یہ شخصی قانون "مہمل" سی بات ہے۔ اور وہی مثل ہے کہ "سارا ہاتھی نکل گیا اور دم پھنس گئی ہے" یعنی اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر آج ایک جرمن۔ یا فرانسیسی یا انگریز یا ایک ہندو اسلام قبول کرے تو وہ اپنی قومی قوانین کے بعض حصے کے لئے نوٹس دے کہ ان کا عمل اسپر موقوف کیا جائے۔ صرف اس لئے کہ اس نے لا الٰہ الا اللہ کا کلمہ پڑھ لیا ہے۔ نہیں۔ درحقیقت قرآن کو قومی و شخصی قانون سے کوئی تعرض نہیں وہ صرف ذریعہ اصلاح اخلاق کے جو ذرائع ہیں۔ اگر ان کے لئے ملکی سیاست جگہ نہیں رکھتی۔ تو قرآن نے مختصراً اسکو بھی سمجھا دیا ہے یا اس کی ایسی اصلاح کردی ہے جس سے اخلاق پر برا اثر نہ پڑے۔ اس نکتہ کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ قرآن کے اوامر و مناہی موقع کے لحاظ سے فرض و واجب و مستحسن وغیرہ ہیں۔ اور قرآن کے ہر حکم کو فرض عین خیال نہ کرلیا جائے۔ مگر قرآن کا دراصل منشا اشاعت توحید اور اصلاح اخلاق ہے اور باقی سب فروع اور ذرایع ہیں جس میں طریقۂ عبادات بھی شامل ہے۔

اگر آج ہندوستان کے مسلمان اس بات کو قطعی بھول جائیں کہ وہ ایک جدا قوم ہیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ان کی قوم کے مختلف اجزا جو ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں اپنی قومی معاشرت و زبان و تمدن کی طرف واپس جاکر اپنے اسلامی خمیر کو جو قرآن سے ان کو ملا ہے۔ ساری قوم میں سرایت کردیں گے۔ لیکن ان سے جدا رہ کر ان کو ایک ایسی تنظیم کی ضرورت ہوگی جو سلطنت کی تعمیر محال ہے۔ اور ہندوستان میں قرآن مختلف زبانوں میں پڑھا اور سمجھا جائے گا۔ کوئی خدا کی عبادت اس طرح کرے گا جیسے رسول اکرم کے وقت مسلمان کرتے تھے۔ کوئی اس طرح جو ہر طرح رقت انگیز اور قابل قبول خدا ہے۔ اپنی زبان ہوگی اپنی رسم اور اپنے طریقے اپنی شرع۔

لکل امۃ جعلنا منسکا ھم ناسکوہ۔ کے ماتحت قومی رنگ جدا ہوگا۔ البتہ ان کے اتفاق کے لئے قرآن و کعبہ باقی رہیگا اس وقت ہم یہ نہ کہیں گے کہ قوم مسلمان ترقی نہیں کرتی۔ بلکہ یہ کہیں گے کہ قوم ہند برسرِ ادج ہے۔ اور ماشاء اللہ وہ مسلمان ہے۔ مگر اس کے خلاف

کیسی کیسی احمقانہ حرکتیں ہم سے ظہور میں آرہی ہیں۔ صرف اس لئے کہ شمالی ہندوستان میں مغلوں نے سلطنت کی۔ ہماری بڑی کوشش یہ ہے کہ ہندوستانی زبان کو فارسی رسم الخط میں لکھیں۔ اس میں فارسی الفاظ ٹھونسیں اور پھر غضب یہ کریں کہ قرآن و مذہب کو اس سے باہر نہ جانے دیں۔ اور اسی زبان کو اس کا زینہ بنائیں۔ بنگالی مسلمانوں کو مجبور کریں کہ وہ اردو سیکھیں۔ اردو اس کا نام رکھیں اور اس کو قومی روایت سے عاری کردیں اور اس میں عربی اور عجمی روایات کو بھرتی کریں۔ کوئی حرج نہیں ہے۔ مگر تم اپنے گرد ایک ایسا حصار کھینچ رہے ہو، جو ہندو کو نہ تم سے ملنے دے گا نہ تمہارے مذہب کی طرف آنے دے گا۔ سب سے طرفہ بات یہ ہے کہ فارسی جو یقیناً غیر اسلامی زبان ہے، اس کو تو اسلامی زبان سمجھی جائے۔ لیکن بھاشا و سنسکرت کو غیر ملکی اور غیر مذہبی حتیٰ کہ اس میں قرآن کا ترجمہ بھی روا نہ ہو۔

پس مسلمانانِ ہند کی پستی کا علاج ہے تو صرف یہ کہ وہ اس غیر فطری حصار کو جو قوم اسلامی کے نام سے وضع کیا گیا ہے، توڑ کر پھینک دیں اور جہاں جہاں سے اس کے اجزا لے کر جمع کئے ہیں وہ واپس کردیں۔ کسی شخص کو محض اس قصور پر کہ وہ مسلمان ہوگیا ہے، عرب بنانے کی سزا نہ دیں، بلکہ اس کو صرف ایک قرآن اسی کی زبان میں دیں اور پھر دیکھیں کہ قرآن کس قدر جلد پھیلتا ہے۔ مسیح نے جو آسمانی بادشاہت کی تشبیہ ضمیر سے دی ہے، وہ درحقیقت اسلام و قرآن کی بہترین تشبیہ ہے۔ اور اگر ہم اس نکتہ کو از خود نہیں سمجھتے ہیں تو خدا ہم کو سمجھا کر رہیگا۔

سید مقبول احمد (بی اے)

عجیب کرشمہ

کایا پلٹ ہیر آئیل

جرمن فارمولا ۵

کہنے کو صرف یہ تیل ہے لیکن اپنے اثرات کے لحاظ سے اکسیر کو بھی مات کرتا ہے۔ یہ تیل نہایت قیمتی اور نادرالوجود نباتاتی و کیمیاوی اجزا سے جدید اصول پر تیار کیا گیا ہے، جس کی تصدیق بڑے بڑے سائنس دانوں نے کی ہے۔ اس کے فوائد کی تفصیل مختصر اشتہار میں ناممکن ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ گھر میں اسکی ایک شیشی رکھنا گویا بہت سے امراض کو دفع کر دیتا ہے۔

اگر۔ سر یا چندیا کے بال گر گئے ہوں یا گر رہے ہیں۔ یا بالخورہ اور گنج ہوگیا ہے۔

اگر نزلہ، درد سر یا شقیقہ، دوران سر، ضعف دماغ و بصر، بے خوابی یا نسیان کی شکایت ہے۔

اگر سر اور جسم کی پھوڑیاں، پھنسیاں، گرمی دانے، خارش یا دیگر امراض جلدی کا دفع کرنا مقصود ہے۔

اگر کنٹھ مالا، سل اور دق وغیرہ سے محفوظ رہنا ہے ——— تو

ان سب کا واحد علاج کایا پلٹ ہیر آئیل ہے

جو نہ صرف خوشبو بلکہ اپنی مقدار و وزن کے لحاظ سے بھی بازار کے تمام خوشبودار تیلوں سے اچھا اور ارزاں ہے۔

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو لکھنؤ سے اپنی تحریر میں تصدیق فرماتے ہیں کہ اس تیل کے فوائد اشتہار کے مطابق پائے گئے ہیں اور مرزا جعفر علیخاں صاحب بی۔ اے ڈپٹی کلکٹر رائے بریلی نے دوامی آرڈر ہر ماہ ایک شیشی کا دیدیا ہے۔ اور بھی متعدد سرٹیفکیٹ موجود ہیں۔ قیمت معہ محصول...... ۳

(نوٹ) جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضروری ہے۔ "مینجر کایا پلٹ ہیر آئیل۔ لکھنؤ"

"خلیق اورنگ آبادی"

کتب خانہ آصفیہ کی ورق گردانی کے دوران میں گلزار معاصرین (نمبر ۴۸۴ دواوین فارسی) کے آخر میں ریختہ کے دس صفحات بھی نظر آئے، جن پر خلیق کے اردو شعر لکھے ہوئے ہیں۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد:-

"ریختہ جات وغیرہ من تصنیف رائے روپ نرائن خلیق تخلص اورنگ بادی" لکھا ہوا ہے

اس میں نہ کہیں سنہ درج ہے اور نہ کاتب کا نام افسوس ہے کہ خلیق کا حال بھی نہیں ملتا صرف "مجلہ عثمانیہ" جلد ۱ نمبر ۴ صفحہ ۱۱ پر شیخ چاند صاحب متعلم جامعہ عثمانیہ نے "اورنگ آباد اور اردو شاعری" پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے مضمون کے "پانچویں دور سنہ ۱۲۶ تا سنہ ۱۳۰" میں خلیق کا نام بھی گنا دیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:-

"اس دور میں اورنگ آباد کی تباہی کے پورے سامان ہو چکے تھے، مشاعروں کی محفلیں گرم تھیں، لیکن کوئی لائق ذکر شاعر نہیں اٹھا البتہ بعض نام ملجاتے ہیں جنہوں نے بزرگوں کی تقلید میں شاعری کی، ان میں خلیق کا نام لینا ضروری ہے، ان کی بعض غزلیں دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا، بہت صاف اشعار ہیں اور کوئی خاص بات نہیں"

موصوف نے خلیق کی غزل کے تین شعر بھی نقل کیے ہیں نہ جانے ان کے پاس خلیق کو سنہ ۱۲۶ تا سنہ ۱۳۰ کا شاعر ماننے کے کیا اسباب ہیں، چونکہ ہمارے سامنے اس وقت کچھ اور مواد نہیں ہے اس لئے ہم سردست یہی فرض کرتے ہیں کہ خلیق کی شاعری کی ابتدا سنہ ۱۲۶ یا اسکے درمیان میں سنہ ۱۳۰ تک ہوئی ہے۔

نام سے پتہ چلتا ہے کہ خلیق کایستہ یا کھتری تھے اور جیسا کہ اس زمانہ کے ہندوؤں کے عقائد تھے حضرت علی علیہ السلام کے مداح تھے، ہر غزل میں "محبت مولا" کا ثبوت دیتی ہے، وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ ہندو مسلمانوں کے عقاید مشترک تھے مسلمان جنکی مدح کرتے تھے ہندو بھی ان کے ثنا خواں تھے اور ایک زمانہ یہ ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے پیشواؤں کو برا بھلا کہتے ہیں تو ہندو مسلمانوں کی قابل تعظیم ہستیوں کی ہجو کرتے ہیں۔ خلیق کے اس مختصر دیوان کی پہلی غزل ملاحظہ ہو، حمد، نعت، منقبت سے ملو ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مذہبی مسلمان کی غزل ہے:-

مجال کیا ہے زباں کو کہے جو حمد خدا — سبھی طرح سیتی ہے لال کیا کرے وہ ثنا
اسی طرح سیتی ناقص ہے نعت حضرت میں — ازل سوں احمد احد ایک ہیں نہیں ہیں جدا
خلاف اسکے جو بوجھے سو بے شبہ کافر — اگر جو صدق ہے دلمیں تو مان میری صدا
چہار چیز سے پیدا کیا ہے انساں کو — مثال اس کے تو ہیں چار یار، رہ نما
خلیق یار علی کا غلام ہو دل سے — ہیں دستگیر تجھے بے شبہ وہ روز جزا

اس غزل کو دیکھ کر کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ خلیق پر اسلام کا رنگ اس قدر چھا گیا تھا کہ انھوں نے اس کی تقلید شروع کر دی تھی، خلیق ہندو تھے اور انکو اس امر کا اعتراف بھی تھا کہ وہ ہندو ہیں۔ ذیل کی غزل کا چوتھا شعر دیکھئے:۔

یا الٰہی مجھے اپنا نہ طلب گار کیا — کاہے کو عشق مجازی میں گرفتار کیا
ہے مجھے یقیں میری شرم سے تجھ کو[1] — مری بخشش کے لئے اپنے کو غفار کیا
بے طلب مجھ کو دیا جو کہ مجھے تھا درکار — دستگیری کو میری احمد مختار کیا
گرچہ ہندو ہوں گنہگار سراپا یا رب — پن گنہگاروں میں مجکو بھی تو سردار کیا
جس کو سردار کیا اس کو نوازا بے شک — جس کو سرشار کیا اس کو پھر ہشیار کیا
مجھ کو لازم ہے یہی سجدہ کروں میں ہر دم — ورنہ میں آن کے دنیا میں نہ کچھ کار کیا
ہیں ترے طالع بڑے تجھ کو میں کہتا ہوں خلیق — سرفرازی کی نظر حیدر کرار کیا

[1] یہ مصرع اسطرح لکھا ہوا ہے

اس منقبت کو دیکھئے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی "نصیری" ہے جو فنا فی علی ہو چکا ہے

چہار یار ہے بر حق خلیق سر کو نیوا — ہمارے دین میں چاروں طرف ہے سجدہ روا
مگر وہ قبلۂ مومن کے مولد عالی — زبانِ خلق میں مشہور ہے گا بیت اللہ
بس آگے وصف کروں کیا کہ یہ مکان و مکیں — جو شرک لائے سو ہے کافر جناب اللہ
علی ہے شیر خدا اور رسول کا داماد — یہ وہ رسول ہے جو نہیں خدا سے کچھ بھی جدا
احد کے لفظ میں جو میم ہو گیا ساکن — وہی ہے میم جو مشکلکشا پسند کیا
دلیل میرے سخن پر حدیث قدسی ہے — خدا نے خاد علی کا حوالہ آپ دیا
گئے تھے قصد جو معراج کا رسولِ کریم — خراماں ہو کے ہوا سامنے وہ شیر خدا
پیام حق کا کئے عرض جبرئیل امیں — کہ دیو خاتم کے تئیں ہاتھ سے اے راہ نما
ہوئے جو محرم اسرار حق بحق نبی حق — ہزار بار ادب سے کہوں میں صلی اللہ
جو دیکھی دست مبارک میں اپنی انگشتر — طعامِ فضل کو کھا کے کئے خدا کی ثنا
تمام آ کے ملائک ادب سے کئے تسلیم — درود پڑھ کے کہے سب نبی رسول اللہ
ادب سے نام لے حضرت نبی علی کا خلیق — کہ تجھ کو ذات انھوں کی شفیع ہے روز جزا

مبارکباد خدا نے کہا علی داماد
یہ وہ علی ہے کہ ہے نام جسکا اسد اللہ

ایسی ہی ایک اور نعت آمیز منقبت کہی ہے:۔

کون کہوے مصطفٰے تئیں ذات اللہ سے جدا | واسطے بخشش کے میری صورت انساں کیا
بھید پایا ہوں خدا کیو اسطے سونا ضرور | خود علم ہو بجبر مشکلشا ظاہر کیا
یہ معمہ گر تو سمجھے ہو یقیں عاقل پسند | تھا احد اول سے آخر میم ہو احمد ہوا
عین میں تیرے علی والے نے بخشی روشنی | کامیابی دو جہاں کی عین میں ہے مدعا

کمترین کمتراں ہے روپ نادانی خلیق
یا علی مشکلشا یا ابوالحسن ناعیلیا

اس کے علاوہ اور بھی متفرق شعر نعت و منقبت میں کہے ہیں، خصوصاً مقطع اسی رنگ کا کہتے گئے ہیں:-

میم احمدؐ میں جو کہ ظاہر ہے | وہی ہے میم میرے مطلب کا
مظہر حق علےؑ مظہر ہیں | فدوی مظہر العجائب کا
حق تعالیٰ سے یہی عرض کرے سگا خلیق | دستگیری کو میری حیدر کرار مرا
ہو دل سے فدا علی ولی کا تو خلیق | اس رمز کو خوب تو تے جانا جانا
خلیق اب یاد ہے مولی علےؑ کی | میرے دل کو علی بھایا سو بھایا
خلیق اب فضل ہے مولیٰ علی کا بے شبہ تجھ پر | وگرنہ کا ہے کو جگ میں نمایاں دلربا کرتا
عاجز خلیق عرض کرے یا علی ولی | جز ذات پاک والا میرے کون ہما—

یہی نہیں کہ وہ "نصیری شیعی" تھے بلکہ ایک "قبر پرست سنی" بھی تھے چنانچہ حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی مدح بھی کی ہے:-

قادر قدرت نما وہ شاہ گیلانی ہوا | قادر مطلق نے بر حق قطب ربانی کیا
دستگیر دو جہاں میراں محی الدین شاہ | نام حق نے حق تمہیں محبوب سبحانی کیا
شکر حق جو اس زباں سے تمیں کہوں پیران پیر | یازدہ سجدہ ادا کر غوث صمدانی کہا
گرچہ ہوں میں سر سے لے پاؤں تلک غرق گناہ | دستگیری کو میری وہ شاہ جیلانی ملا
اے خلیق لازم ہے تجکو دمبدم سجدہ کرے | خوف کیا ہے غوث اعظم ہے تری حارا (جنت)

کسی کو "مرشد کامل" بھی بنالیا تھا چنانچہ کہتے ہیں:-

بھول مت حکم مرشد کامل | رب ارنی ہے دیکھنا اپنا

عید میں بھی قربانی کرتے تھے اور جیسے بھی نذر لیجانا نہیں چاہتے، مقصد یہ ہے کہ زندہ رکھکر نذر کیا لیجائیں قربان ہی کیوں نہوں!

یہ عید جو آج آئی ہے قربانی کی | کیا جی کے نذر تیری لے آنا جانا

بعض اشعار نہایت ہی عمدہ اور صاف کہے ہیں اور "مرشد کامل" کے تذکرے میں جو شعر نقل ہوا ہے اسکے ساتھ دو شعر اور ملکر قطعہ بند کیا ہے:-

بھول مت حکم مرشد کامل — رب ادنیٰ ہے دیکھنا اپنا
ماورا اس کے لن ترانی ہو — مشتِ کوہِ طور آپ میں کھینا
نکر مانندِ مہر ہر ذرہ گرد — جس جگہ جانا اس جگہہ دھینا

دیکھئے یہ غزل مسلسل کہی ہے اور کس قدر اچھی کہی ہے، خاص کر مطلع آج کل کے لئے کوئی نئی بات نہیں مگر اس زمانہ کے تخیل کے لحاظ سے ایک عمدہ چیز ہے۔

نہوتا کوئی تیرا عاشق تو اے معشوق کیا کرتا — تو اپنی خوبصورت کو لئے خالی پھرا کرتا
ہمارے عشق نے مغرور تجکو کردیا ظالم — وگرنہ سانس ٹھنڈی رات دن ہر دم بھرا کرتا
اگر اس باغِ الفت کا نہ ہوتا باغباں میں تو — چمن کے حسن کو تو کس طرح سیتی ہرا کرتا
نگاہِ عشق نے میرے ، — نہیں تو حسن کو اپنے جلا کر کیا طلا کرتا

ذیل کے اشعار کتنے اچھے ہیں اور خاص کر مطلع کا مصرع "یہ دل ہے جس طرف آیا سو آیا" کس غضب کا ہے!

مزہ جو عشق کا پایا سو پایا — یہ دل ہے جس طرف آیا سو آیا
ارے زاہد عبث بکوا کرے ہے — ہمارے دل کو جو بھایا سو بھایا
شہادت کا مزہ اس کو ہے معلوم — جو زخم عشق کو کھایا سو کھایا
خدا کے واسطے منظور کریو — یہ سر دل کی نذر لایا سو لایا

دکن کے اساتذہ نے اس میں میں خوب طبع آزمائی کی ہے، خلیق نے بھی اچھی غزل کہی ہے، ملاحظہ ہو۔

عجب گھڑی تھی کہ جو دل گیا سو پھر نہ پھرا — پتنگ کے طور پہ جو جل گیا سو پھر نہ پھرا
ارے یہ زخم کو دل کے دکھاؤں میں کسکو — کہ قتل کر کے جو قاتل گیا سو پھر نہ پھرا
کیا تھا وعدہ کہ میں شام کو پھر آؤں گا — مثال مہر کے جو ڈھل گیا سو پھر نہ پھرا
تیری نگاہ کے کیا تیر ہیں اے کافر! — یہاں سے آج جو گھایل گیا سو پھر نہ پھرا
ارے خلیق عجب ہے فنا کا ملکِ خموش — زمانہ سیتی جو کابل گیا سو پھر نہ پھرا

اسی بحر میں قافیہ بدل کر ایک اور غزل کہی ہے۔

جہاں کے خواب میں جو دم گیا سو پھر نہ پھرا — مثال آہو کے جو رم گیا سو پھر نہ پھرا!
عجب بلا ہے قیامت یہ عشق کی منزل — کہ اس کی راہ میں جو گم گیا سو پھر نہ پھرا
یہ زخم دل کا تو ناسور ہو گیا ہے آہ! — جگر کا میرے جو مرہم گیا سو پھر نہ پھرا
ہوئی ہے شام مجھے اسکی انتظاری میں — الٰہی آج جو برہم گیا سو پھر نہ پھرا

دنیا اور زندگی کو لوگوں نے خواب سے تشبیہ دی ہے اور اسی طرح خلیق نے بھی مگر کس قدر سادگی ہے۔

یہ جہاں تو مثال ہے سپنا — آپ میں آپ سوچنا جینا

رباعی اور غزل کا دکن میں بہت کم فرق تھا، خلیق کے زمانہ میں رباعی کی طرح غزل بھی اسی بحر میں کہی جاتی تھی، دیکھئے بعض شعر کتنے اچھے ہیں

دل دل سے ملا کے آج جانا جانا — مئے ہم کو پلا کے آج جانا جانا!
چھوٹے ہو جہاں میں اور رہم سے سیکھے — قسمان کھانا اور پھر نہ آنا جانا!
دلدار اگرچہ جگ میں لاکھوں ہیں گے — دل میرا ہوا ترا دیوانا جانا!

محبت کی چاٹ بری ہوتی ہے کس مزے سے کہتے ہیں:-

جس کو لاگا ہے پیکا تجھ لب کا — بھولتا ہے وہ ذائقہ سب کا

ذیل کے متفرق شعر دیکھئے کتنے صاف ہیں:-

جان من! جان تجھ کو کہتا ہوں! — دیکھ تو آشنا ہوں میں کب کا!
عشق سے آن پڑا ہیگا خدا کا رمیرا — ذات تیری کے سوا کوئی نہیں غمخوار میرا
رشتہ ہی دانۂ تسبیح کو زنار کے ساتھ — اس سبب رشتۂ الفت ہے ہار میرا
لازم ہے تجھ کو ورد کرے نام پنجتن — دافع تیری بلا کے ہیں وہ شاہ کربلا
سب کو قضا قضا ہے رضا کو نہیں قضا — جسمیں رضا قضا کی ہو وہ ہے قضا رضا
سب سے بہتر ہے اے خلیق مرے — شمع سا گھل کے آپ میں کھپنا

گو خلیق کے کلام میں کوئی خاص بات نہیں اور نہ ان کے کلام سے حالات ہی معلوم ہو سکے مگر ایک سو سال پہلے کی شاعری کا نمونہ ضرور ہے اور اسی لئے ہم نے خلیق کو روشناس کرانے کی کوشش کی، ممکن ہے کہ کبھی مکمل دیوان مل جائے اور کسی جگہ حالات بھی نظر آئیں۔ ایسے سینکڑوں گمنام شعرائے دکن کا کلام ہمارے پاس محفوظ ہے جن کے حالات وغیرہ نہیں ملتے، انشاءاللہ یکے بعد دیگرے ان سب کا کلام پیش کیا جائے گا۔

سید تمکین کاظمی

کتاب علم فراست الید

اگر آپ نے ابتک نہیں ملاحظہ کی تو اب طلب فرمائیے۔ قیمت علاوہ محصول عمر (منیجر نگار لکھنؤ)

مُصحفی کا مرتبۂ شاعری

آزاد کی تنقید - میر و مصحفی کا تقابل

(۱)

اسلوب شاعری اور انداز بیان کے لحاظ سے قدیم اردو شاعری کو تین صورتون مین تقسیم کیا جا سکتا ہے

۱- سادہ و بے تکلف زبان مین نرم نرم محبت کی باتین وصل کا ارمان، فراق کی المناک کیفیت اور جذبات انسانی کی صحیح ترجمانی جیسی میر تقی - درد - سوز - یقین - بیان - ہدایت اور بیدار نے کی کسی سے بن آئی ان شعرا کی غزلین پڑھو اور اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھو کہ کہان تک صحیح کہتے ہین

۲- جوش و خروش کلام کی گرمی، دلاویزی سنگلاخ زمینون اور مشکل ردیف قافیون مین شعر کی آب و تاب دیکھنا چاہو تو میرزا رفیع سودا - قائم اور بقا کا کلام دیکھو

۳- اگر روزمرہ و محاورہ مین بیان کی بے تکلفی اور سادگی دیکھنا چاہو تو میر تقی اور میر سوز کی غزلین پڑھو جن پر ہزار بناوٹین قربان ہین زمانۂ مابعد مین جسقدر شعرا مشہور ہوئے ان مین سے ہر ایک نے انھین اساتذہ متقدمین مین سے کسی نہ کسی کے اسلوب بیان کو شمع راہ بنایا - مثلاً جعفر علی حسرت نے سوز و گداز کی آمیزش کر کے میر سوز کے سادہ و سلیس انداز بیان کو رونق دی - میر حسن نے تمام و کمال میر تقی کی تقلید کی - جرأت نے معاملات عاشقانہ کے اضافہ کے ساتھ اپنے استاد کے رنگ کو قایم رکھا - انشا نے ترکیب الفاظ اور انداز کلام مین اور شاہ نصیر نے مشکل ردیف اور قوافی کو اختیار کرنے مین مرزا سودا کو اپنا امام بنایا - مرزا غالب اور حکیم مومن خان مومن نے فارسی کی لطیف اور نادر ترکیبون کے ساتھ میر تقی کے رنگ کو زمین سے آسمان پر پہونچایا - اور سب سے اخیر مین مرزا داغ نے سلاست و روانی، برجستگی اور بیساختگی کے موتیون سے میر سوز کے سادہ انداز بیان کو ایسا سجایا کہ سارے ہندوستان مین دھوم ہو گئی - لیکن شیخ مصحفی کی ہمہ گیر و ہمہ رنگ طبیعت نے کسی خاص رنگ پر قناعت نہ کر کے مشاہیر شعرائے متقدمین و متاخرین مین سے تقریباً ہر ایک کے انداز سخن کا پسندیدہ نمونہ پیش کیا ہے - چنانچہ ان کی غزلون مین کہین میر کا درد ہے - تو کہین سودا کا دبدبہ، کسی مقام پر فغان کی رنگینی ہے تو کسی جگہ سوز کی سادگی - کہین واقعات مین جرأت کی سلاست و حقیقت نویسی سے کام لیا گیا ہے تو کہین ترکیب الفاظ اور انداز بیان مین انشا کا طنطنہ و جبروت صرف ہوا ہے - کہین پر غزلون کو واقعات مسلسل پر ختم کرنے مین مرزا جعفر علی حسرت کا رنگ کلام پیش نظر ہوتا ہے - تو کہین مشکل ردیف قافیہ مین

شاہ نصیر کا کمال سامنے آجاتا ہے اور جن غزلون اور بیتون مین ان اساتذہ کی خوبیون کو ان کی کہنہ مشقی اور اُستادی یکجا کر دیتی ہے ان کا شمار لاریب اردو شاعری کے بہترین نمونون مین کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ مین تو یہانتک کہنے لئے طیار ہوں کہ دور آخر کے اساتذہ غالب و مومن بلکہ داغ کی ساحرانہ خصوصیات کلام کا بھی بیشتر حصہ ان کے کلام مین موجود ہے۔ اور جس طرح خواجہ حافظ شیرازی اپنی ہمہ گیری اور اپنی ہمہ رنگی کے باعث شعرائے فارسی مین بلبل شیراز کے بامعنی خطاب سے مخاطب ہین اسی طرح شیخ مرحوم کو اُردو شعرا کے گروہ مین عندلیب ہزار داستان کا درجہ حاصل ہے

اس دعوے کو پایۂ ثبوت تک پہونچانیکے لئے یہ ضروری نہین کہ شیخ مرحوم کے کلام کو تمام شعرائے مذکورہ کے کلام کے بالمقابل رکھا جائے۔ کیونکہ انشا۔ شاہ نصیر اور ذوق کی شاعری مین مرزا سودا کی شاعری کا عکس ہے۔ اور میر حسن، جرأت، وحسرت کا کلام میر تقی اور میر سوز کے رنگ کلام کا منت پذیر۔ پس جس شخص کی شاعری مین میر و میرزا دونون اُستادون کے کلام کی خصوصیات موجود ہونگی۔ لامحالہ ان تمام شعرا سے مماثل ہوگا۔ البتہ مومن و غالب اور داغ سے تقابل کرنے کے لئے علیحدہ علیحدہ ابواب کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ان حضرات نے اپنی جدت پسند طبائع سے کام لیکر کچھ ایسی بات پیدا کرلی ہے کہ شعرائے متقدمین کے مقلد ہوتے ہوئے بھی ان کی شاہ راہ جدا اور ان کا پیرایہ بیان بالکل علیحدہ نظر آتا ہے۔ اور اسی پیرایۂ بیان کا طفیل ہے کہ مرزا غالب و مرزا داغ ایک طرز خاص کے موجد و مخترع تصور کئے جاتے ہین سب سے پہلے میر تقی اور شیخ مصحفی کے کلام کا موازنہ کیا جاتا ہے

میر تقی کا انداز میر صاحب کے کلام کی خصوصیتین آزاد نے ان لفظون مین بیان کی ہین

"غزل کے لئے عاشق و معشوق کے خیالات عشقیہ، ذکر وصل، شکایت فراق، درد انگیز اور المناک حالت گفتگو ایسی بے تکلف، صاف اور نرم نرم گویا وہی دونون بیٹھے ہوئے باتین کر رہے ہین اس کے اوائے مطلب کے لئے الفاظ بھی اور ہین اور اسکی بحرین بھی خاص ہین میر صاحب کی طبیعت قدرتی درد خیز اور دل حسرت انگیز تھا۔ کہ غزل کی جان ہے اسلئے اُن کی غزلین ہی ہین اور خاص خاص بحور و قوافی مین ہین" (آبِ حیات صفحہ ۱۶۴)

میر کی طرح شیخ مصحفی کے کلام مین بھی ایک خاص قسم کی خوشگواری و روانی پائی جاتی ہے اور اسکے چند اسباب ہین۔ اول تو انھون نے شگفتہ اور چھوٹی چھوٹی بحرین اختیار کی ہین جن مین خواہ مخواہ بات کو صفائی سادگی اور اختصار سے ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور چونکہ سادہ و مفرد خیالات کے لئے اس قسم کی بحرین خاص مناسبت رکھتی ہین۔ اس لئے جن مضامین کے اظہار کے لئے انھین انتخاب کیا گیا ہے۔ سوادِ الفاظ سے چودھوین رات کے چاند کی طرح ہر جگہ نمایان و درخشان ہین۔ یہی وجہ ہے کہ جن غزلون یا بیتون مین پُر درد مضامین ہین اُن کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر کا کام دیتا ہے۔ اور جہان پُرجوش خیالات ہین دو چار شعر پڑھنے کے بعد جوش و خروش پیدا نہ ہونا ناممکن ہے۔۔ اس سلسلے مین بعض ایسی بحرین بھی ہین۔ جن کی تخلیق مین فطرتاً ترنم اور موسیقیت کا

عنصر بہت زیادہ ہے اس لئے جب ان مین شعر کہا جاتا ہے تو لامحالہ طبیعت کو ایک قسم کا لطف حاصل ہوتا ہے - پھر ان مین شعر کے اجزا بلکہ مصرعون کے ارکان بھی ایسے فراہم کئے ہین - جو تال اور سم کا کام دیتے ہین - اور جہان جہان یہ حصے ختم ہوتے ہین صاف معلوم ہوتا ہے کہ گانے کی تان ٹوٹ رہی ہے - سب سے زیادہ یہ بات ہے کہ الفاظ زیادہ تر اس قسم کے جمع کئے ہین جن کی آوازین ایک دوسرے سے موافقت و توازن رکھنے کے باعث خوش آیند معلوم ہوتی ہین ۔ دوسرے یہ کہ ردیف کی تلاش مین بڑی کوشش و کاوش سے کام لیا ہے - ردیف جیسا کہ بعض اہل فن کا خیال ہے - حسن و زیبائش کے علاوہ اردو شاعری مین خیالات کی وسعت رنگینی اور تنوع کا سب سے بڑا ذریعہ ہے - کیونکہ ردیف بدلنے کے ساتھ ہی قافیے کی حیثیت بھی تبدیل ہو جاتی ہے - اور ردیف کو بدل بدل کر ایک ہی قافیہ کو سیکڑون طرح سے موزون کیا جا سکتا ہے علاوہ برین ردیف بذات خود شعر کا ایک زیور ہے - اور ترنم و موسیقیت پر اسکا گہرا اثر پڑتا ہے - اسی تلاش کا یہ اثر ہے کہ معانی ردیف کے تنوع نے شیخ مصحفی کے کلام مین رنگینی و وسعت کی وہ دنیا پیدا کر دی ہے جسکے ایک ایک کونے مین سیکڑون گلہائے رنگا رنگ اپنی بوقلمونی کی بہار دکھا رہے ہین - اور یہ بات متقدمین و متاخرین مین سے شاید کسی کو نصیب نہ ہو سکی - مشاعرون کی طرحی غزلیات اور دوست احباب کے فرمائشی کلام کو چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ وہ دوسرون کی پاسداری اور اپنی میلان خاطر و رنگ طبیعت کی مخالفت دو ایسے داغ ہین جو حسن کلام اور خوبی بیان کے چہرے کو ذرا بدنما بنا دیتے ہین - (حسب روایت صاحب آب حیات یہ بات میر صاحب مین بھی موجود تھی) باقی جسقدر غزلین ہین سب کی سب اچھوتی اور خوشگوار ردیفون مین لکھی گئی ہین - جن کو مضامین تغزل کی مناسبت نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے تیسرے یہ کہ قوافی کے استعمال مین خصوصیت کے ساتھ اس خیال کو مدنظر رکھا ہے کہ حروف قافیہ مین کیفیت آمیز توازن قائم رہے - اور ایسے قوافی سے پرہیز کیا ہے - جن کے حروف مین سخت بیگانگی یا آوازین حد سے زیادہ کراہت و ثقالت پائی جاتی ہے - انہین مرزا سودا خصوصاً سید انشا کی طرح یہ خبط کبھی نہین پیدا ہوا کہ دماغ مین سمائے ہوئے ہر ایک مضمون کو خواہ مخواہ لفظون مین ادا کر دین چاہے اس مین شعر کی لطافت قافیے کی خوبی بیان کی روانی حتی کہ شعر کے مقصود اصلی کا خون کیون نہ ہو جائے بلکہ وہ قافیہ کی شگفتگی الفاظ کی موسیقیت اور سب سے زیادہ مضمون کی سلاست کو تلاش مضمون پر ترجیح دیتے تھے - اور یہی ناقابل عفو بلکہ قابل سزا قصور ہے جسکی پاداش مین بعض کوتاہ اندیش و کم سواد حاسدین کو یہ کہنے کا موقع مل گیا ہے کہ ان کے یہان صرف باتین ہی باتین ہین تازگیٔ خیال و بلندی فکر نظر نہین آتی - گویا ان لوگون کے نزدیک وہی باتین شیخ مصحفی مرحوم کے معائب کلام مین داخل ہین جنھین غزل کی جان کہنا چاہئے غزل کی جان کیا ہے؟ درد، سوز و گداز، جذبات و معاملات عشق عجز و نیاز اسکے ساتھ یہ شرط بھی ہے کہ جذبات و معاملات جس زبان مین ادا کئے جائین وہ بھی زبان ہو جسمین عاشق اپنے معشوق سے راز و نیاز کی باتین کرتا ہے - یعنی سادہ ہو بے تکلف ہو، نرم ہو، لطیف ہو، نیاز آمیز ہو اسکے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ چھوٹی چھوٹی بحرین ہون، جملون کی ترکیب مین نام کو الجھاؤ نہ ہو قریب الفہم خیالات ہون -

اور یہ تمام باتین ایک ایک کرکے ہمارے فطرت نگار شاعر کے عاشقانہ کلام مین رونما ہین - سنئے

رہنے دو میرے سینے مین پیکاں کو نہ چھیڑو
از بہرِ خدا ناوکِ جاناں کو نہ چھیڑو

یہ وہ نہین ناسور کہ ہو بند کسی سے
بہنے دو میرے دیدۂ گریان کو نہ چھیڑو

ٹک رحم کرو چاکِ گریبان پہ ہمارے
یارو کوئی اُس شوخ کے دامان کو نہ چھیڑو

اے ناصحو کچھ فکر کرو چاکِ جگر کی
بیکار مرے چاکِ گریبان کو نہ چھیڑو

دکھتا ہے یہ دل اور بھی فریاد کرے ہے
مت ہاتھ لگاؤ دلِ نالان کو نہ چھیڑو

رہنے دو پڑا مصحفیِ خاک بسر کو
اس غمزدۂ بے سر و سامان کو نہ چھیڑو

تمام غزل مین سوز و گداز کے خیالات اس طرح ادا کئے ہین جس طرح آگ سے دھوان اُٹھتا ہے، ایک اور غزل ہے:-

مین وہ نہین ہون کہ اُس بت سے دل مرا پھر جائے
پھرون مین اُس سے تو مجھسے مرا خدا پھر جائے

اگر مین رونے پہ آؤن برنگِ ابرِ بہار
ابھی زمانے کی اے دوستو ہوا پھر جائے

شبِ فراق مین بچنا بشر کا مشکل ہے
یہ بات اور ہے آئی ہوئی قضا پھر جائے

خدا کرے نہ ملے اُسکو آشنا کوئی
اگر کسی سے کوئی ہو کے آشنا پھر جائے

جو دے سکے نہ رہِ عشق مین ہمارا ساتھ
ہمارے ساتھ نہ آئے وہ آشنا پھر جائے

عجب نہین کہ تری خو کے ڈر سے اے ظالم
زبان پہ آکے مرے حرفِ مدعا پھر جائے

پکارتا ہے تجھے مصحفی جواب تو دے
کھڑا رہے یہ ترے آستان پہ یا پھر جائے

یہ رنگ تغزل جرأت کے یہان اور سید انشا کے یہان نہ ہونے کے برابر پایا جاتا ہے۔

باندھ آیا تھا کمر وہ دشمنِ جان کھینچکر
کتنا پچھتائے ہین ہم کل اُسکا دامان کھینچکر

آج اس وحشی نے لی پھر راہِ صحرا ہم جسے
کل بہ مشکل لے گئے تھے تا بہ زندان کھینچکر

ساتھ پیکان کے نکل آیا جو دل بیٹھا ہوا
کتنے پچتائے مرے سینے سے پیکان کھینچکر

کچھ نہین معلوم ہوتا ہمکو جرمِ مصحفی
پیٹتے ہین یار کیون اسکا گریبان کھینچکر

زمین ایسی کہ طبیعت اُلجھن اور ذہن کشاکش مین پڑ جائے لیکن قافیون کی تلاش اور ردیف کے ساتھ اُن کی پیوستگی نے اسی کو شگفتہ بنا دیا ان دونون باتون کے ساتھ مضامین کی عمدگی زمین سے آسمان پر لے اُڑی

ساقی شراب لایا مطرب رباب لایا
مجھپر تو اک قیامت عہدِ شباب لایا

دل درد و غم کی اُسکے آخر نہ تاب لایا
یہ ہر گھڑی کا رونا اور اک عذاب لایا

کیا دور ہے جو پردہ رُخ سے ترے اُٹھا دے
دنیا مین مہر و مہ کو جو بے نقاب لایا

کہتا نہ تھا مین اے دل جانا نہ اس گلی مین
آخر تو مجھپر آفت خانہ خراب لایا

نامے کے مرے ٹکڑے لاڈالے میرے آگے — نامہ کا میرے قاصد یہ کیا جواب لایا
آئینہ کیا کہ اُسنے پتھر پہ جب نظر کی — چہرہ پر اپنے وہ بھی اک آب و تاب لایا
اے مصحفی تو اب منہ کیا دیکھتا ہے مے بھی — ہاتھون سے اپنے ساقی جام شراب لایا

اول سے آخر تک بندش چست، الفاظ صحیح، ترکیب مناسب اور مضامین متین و سنجیدہ ہین خصوصاً پانچوان شعر اپنی جگہ پر ایک چیز ہے۔ جسے نواب مصطفےٰ خان شیفتہ جیسا عالی دماغ خیال نقاد بھی بغیر انتخاب کئے نہ رہ سکا، ہر مصرع کے ارکان اس خوبصورتی سے جمع کئے گئے ہین کہ شاعری اور موسیقیت یکجا معلوم ہوتی ہین

میر صاحب کی دوسری خصوصیت کا تذکرہ ان لفظون مین کیا گیا ہے

"میر صاحب کی زبان شُستہ، کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتین کرتے ہین دل کے خیالات کو جو سب کی طبیعتون کے موافق ہین محاورہ کا رنگ دیکر باتون باتون مین ادا کر دیتے ہین اور زبان مین خدانے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتین ایک مضمون بن جاتی ہین اسی واسطے ان مین بہ نسبت اور شعرا کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے۔ بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے۔ گویا نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہین۔ یہی سبب ہے کہ دلو نپر اثر بھی زیادہ کرتی ہین۔ وہ گویا اُردو کے شیخ سعدی ہین (آب حیات صفحہ ۱۶۴)

"میر تقی کہین کہین میر سوز کے قریب آجاتے ہین پھر بھی بہت فرق ہے وہ بھی (میر تقی) محاورہ خوب باندھتے تھے۔ مگر فارسی کو بہت نبھاتے تھے۔ اور مضامین بلند لاتے تھے (آب حیات صفحہ ۲۱۳)

شیخ مصحفی مرحوم کی زبان مین بھی صفائی و سلاست حد سے زیادہ ہے اگرچہ اسوقت کی ترکیبین فارسی سے مستعار تھین۔ اور کچھ الفاظ متروک ہوجانے کے باعث اب کانون کو غیر مانوس معلوم ہونگے۔ نیز بعض اسماء کی تذکیر و تانیث بھی جھگڑے کی بات ہے۔ تاہم مجموعی حیثیت سے شیخ مرحوم کی زبان نہایت صاف و شستہ ہے۔ اور یہ صفتین دونون باکمالون کے یہان اس مناسبت کے ساتھ موجود ہین کہ آج بھی کسی کی زبان کو میر و مصحفی کی زبان سے تشبیہ دیکر اُس کی خوبی کا اعتراف زباندانی کی سند دینے کے برابر ہے۔ مشابہت زبان کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے کہ لوگ مصحفی مرحوم کے کلام کو بعض اوقات میر تقی کا کلام سمجھنے لگتے ہین شیخ صاحب کا کلام دور از کار استعارات، بعید از قیاس مبالغہ اور غیر فطری بیان سے قطعی خالی ہے۔ انھون نے قلبی واردات و کیفیات کو نہایت سادہ۔ صاف اور شستہ زبان مین ادا کیا ہے جنمین اسلوب بیان کی دلکشی نے وہ بات پیدا کر دی ہے کہ بعض بعض غزلون کا ایک ایک شعر سوز و گداز کی تصویر نظر آتا ہے۔ ان مین الفاظ کا صحیح استعمال اور ان کی ترتیب و ترکیب خاص کیفیت رکھتی ہے۔ اور ان سب باتون نے یکجا ہوکر شیخ مصحفی مرحوم کی زبان کو بھی اسی طرح سہل ممتنع بنا دیا ہے جس طرح میر کی زبان کو، مثلاً:۔

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا
تجھے کس نے روک رکھا تیرے جی مین کیا یہ آئی کہ گیا تو بھول ظالم ادھر التفات کرنا
یہ دعا ہے مصحفی کی جو اجل بھی اسکی آئے شب وصل کو تو یا رب نہ شب وفات کرنا

جو ہم سے وعدۂ دیدار یار ٹھہرے گا تو کچھ نہ پچھ یہ دل بیقرار ٹھہرے گا
چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم کہین تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا
یہی ہے دل کا دھڑکنا مرے اگر تہ خاک تو کیا مزار پہ سنگِ مزار ٹھہرے گا
جو سیر کرنی ہے کرلے کہ جب خزان آئی نہ گل رہیگا چمن مین نہ خار ٹھہرے گا
یہی ہے لوٹ تو دست جنون کے ہاتھون سے نہ ایک میرے گریبان کا تار ٹھہرے گا
شتاب آئیو ٹھہرا رکھین گے ہم اسکو جو دم لبون پہ شب انتظار ٹھہرے گا
اسے نہ دفن کرو ہمدمو یہ سمجھو تو لحد مین مصحفیؔ بے قرار ٹھہرے گا؟

معانی ردیف کے اختلاف سے محاورات کی وسعت پر خاص طور سے روشنی پڑتی ہے ہر شعر مین "ٹھہریگا" اپنے مفہوم کے خاص ہے چھٹے شعر کو دیکھئے انتظار معشوق مین عاشق کا دم لبون پر آجانا ایک بے اختیاری کیفیت ہے۔ لیکن "ٹھہرا رکھین ہم اسکو" خاص صبر وتحمل کی صورت ہے۔ "شتاب آئیو" کہنے کا موقع اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے تیسرے شعر مین "مزار ٹھہریگا" کی مشکل ترکیب کو کس خوبی سے ایک لفظ سنگ نے اپنی جگہ بٹھا دیا ہے مقطع کے محاسن ظاہر ہین۔

ہے طرفہ ماجرا مرے قاتل کے سامنے بسمل پڑا تڑپتا ہے بسمل کے سامنے
حسرت پر اُس مسافر بیکس کی رویئے جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے
افسوس کی جگہ ہے کہ دریائے عشق مین کیا کیا غریب ڈوبے ہیں ساحل کے سامنے
جارہئے اس جگہ کہ جہان اچھی صورتین بے پردہ ہوکے آتی ہین سائل کے سامنے
اے مصحفیؔ طلسمِ جہان سے نہ دل لگا قدر اسکی کچھ نہین کسی عاقل کے سامنے

تمام شعرون سے قطع نظر دوسرے شعر مین مسافر بیکس کی حسرت کا خاکہ ایسا کھینچا ہے کہ شہرت و قبولیت کے سبب سے زبان زد خاص و عام ہو گیا ہے

اسی سلسلے مین وہ کہین فارسی کی اچھوتی اور مزیدار ترکیبین بھی استعمال کر جاتے ہین اور اس صفت نے اُنھین میر کے رنگ سے کسی قدر ممتاز اور میر تقی کے رنگ سے مماثل کر دیا ہے

ہجران مین بسکہ تجھ پہ عذاب الیم تھا ہر شعلہ آہ کا مری نار جحیم تھا

کرتے تھے گل مزار سے میرے شگفتگی — یعنی کبھی ادھر بھی گذارِ نسیم تھا
افشائے عشق بعد خدا جانے کیا بنے — جب تک حجاب تھا یہی امید و بیم تھا
کس زلف مشکفام کی بو تھی کہ باغ مین — ہر ایک غنچہ نافۂ عنبر شمیم تھا
چلتی تھی تیغ وان سرِ دشمن پہ مصحفی — اور میرا مارے اشک کے یان دل دو نیم تھا

تیری رفتار سے اک بے خبری نکلے ہے — مست و مدہوش کوئی جیسے پری نکلے ہے
اک فریبندہ ہے تیری روشِ طرزِ خرام — اسکے عہد بیے کوئی کبکِ دری نکلے ہے
گل کو نسبت ہے اسی واسطے با اہل جنون — وضع مین اسکے جو اک جامہ دری نکلے ہے
اپنے رونے کو کوئی سمجھے تو آئینہ مثال — دیدۂ خشک سے آنسو کی تری نکلے ہے
کھول دیتا ہے تو جب جاکے چمن مین زلفین — پا بہ زنجیر نسیم سحری نکلے ہے
مصحفی کس کے کھُلے بال تو دیکھ آیا ہے — کہ تری وضع سے شوریدہ سری نکلے ہے

نکلے ہے تو میر و مصحفی کی زبان تھی لیکن فریبندہ - طرزِ خرام - اہل جنون - دیدۂ خشک اور پا بہ زنجیر کی فارسی ترکیبین جس خوبصورتی سے استعمال ہوئین وہ اس بات کا ثبوت ہین کہ شیخ مصحفی مرحوم اس رنگ مین بھی میر صاحب کے ہم پلہ ہین - بلکہ جن لوگون کو خدا نے دل دی ہے وہ تو یہانتک کہہ گئے ہین کہ اگرچہ شیخ مصحفی کی زبان میر و مرزا سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے لیکن اس درجہ سبک اور شیرین واقع ہے کہ اکثر اسکی حلاوت اس زمانے مین بھی ناظرین کے دلون مین اُسکے متروک الاستعمال ہونے کا گمان نہ پیدا ہونے دیگی" (حسرت موہانی)

مثلاً

جب واقفِ راہ و روشِ ناز ہوئے تم — سچ ہے کہ عجب خانہ برانداز ہوئے تم
مین تم سے نہ بولون گا کبھی اے لب بستہ — اُس بن پہ تبسم بھی اگر باز ہوئے تم
پہنی جو قبا جامۂ گل دوز کی تم نے — طاؤس صفت اور بھی طناز ہوئے تم
پھولے نہ سمائینگے تمھین تازہ نہالانِ چمن کیا — اب نام خدا سروِ سرافراز ہوئے تم
اے مصحفی مرغانِ چمن رہ گئے خاموش — گلشن مین اگر زمزمہ پرداز ہوئے تم

تمام الفاظ قوافی فارسی ہین لیکن اجنبیت اور غرابت کا کہین پتہ نہین گویا میر صاحب کی طرح شیخ مصحفی نے بھی غزل کی ایک خاص زبان قائم کر لی تھی - جیسا کہ ایک جگہ خود فرماتے ہین

یون تو کہنے کو سبھی شعر و سخن کہتے ہین — مصحفی ریختہ گوئی کی زبان اور ہی ہے

رات پردے سے ذرا منہ جو کسو کا نکلا — شعلہ سمجھا تھا اُسے مین پہ جگنو کا نکلا
مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم — تیرے دل مین تو بہت کام رفو کا نکلا

ترسا نہ مجھکو کھینچ کے تلوار مار ڈال — گر مار ڈالنا ہے تو اک بار مار ڈال
صیاد تجھکو کس نے کہا تھا کہ فصل گل — مجھکو قفس مین کرکے گرفتار مار ڈال

"تجھ سے کہا تھا" کی جگہ "تجھکو کہا تھا" قدیم زبان ہے

اس نازنین کی باتین کیا پیاری پیاریان ہین — پلکین ہین جس کی چھریان آنکھین کٹاریان ہین
دل کی طپش کا اپنے عالم ہی کچھ جدا ہے — سیماب و برق مین کب یہ بیقراریان ہین
نومید ہین بظاہر گو وصل سے ہم اُس کے — دل مین تو سو طرح کی امیدواریان ہین
کیا پوچھتے ہو ہمدم احوال مصحفی کا — راتین اندھیریان اور اختر شماریان ہین

میر صاحب کی تیسری خصوصیت کی تفصیل یہ ہے

ہمارے عاشق مزاج شعرا کی رنگینیان اور خیالات کی بلند پروازیان ان کے مبالغون کے جوش وخروش سے کچھ معلوم ہین ۔ مگر اسے قسمت کا لکھا سمجھو کہ ان مین سے بھی میر صاحب کو شگفتگی یا بہار عیش ونشاط یا کامیابی وصال کا لطف کبھی نصیب نہ ہوا وہی مصیبت اور قسمت کا غم جو ساتھ لائے تھے اسکا دکھڑا سناتے چلے گئے ۔ جو آج تک دلون مین اثر اور سینون مین درد پیدا کرتے ہین کیونکہ ایسے مضامین اور شعرا کے خیالی تھے اور ان کے حالی تھے ۔ عاشقانہ خیال بھی ناکامی زارنالے، حسرت ومایوسی ہجر کے لباس مین خرچ ہوئے ان کا کلام صاف کہہ دیتا ہے ۔ کہ جس دل سے نکلکر آیا ہون ۔ وہ غم ودرد کا پتلا نہین حسرت واندوہ کا جنازہ تھا ہمیشہ وہی خیالات بسے رہتے تھے ۔ بس جو دلپر گذرتے تھے وہی زبان سے کہہ دیتے تھے ۔ کہ سننے والون کے لئے نشتر کا کام کرجاتے تھے ۔ (آب حیات)

شیخ مصحفی مرحوم کا اصلی میدان بھی حسرت وناکامی کا اظہار اور حرمان ومایوسی کا بیان ہے کلام کو دیکھئے بد قسمتی کا شکوہ آسمان کی گردش کا رونا، احباب واعزہ کی مفارقت، کوشش وسعی مین ناکامی اور اپنی بیکسی وبیبسی غرض اس قبیل کا کوئی مضمون نہین جسے انھون نے نظر انداز کردیا ہو ۔ بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ غم والم کا ایک سیاہ بادل ان پر چھایا ہوا ہے جس سے خوشی وخرمی کے سورج کی ایک کرن بھی چھنکر ادھر نہین پڑتی ۔ یا ایک حرمان نصیب قیدی ہے جو اپنی مصیبت خیز زندگی گذارنے مین مصروف ہے یہانتک کہ زارنالی کے مضامین کی بہتات اور مایوسانہ مضامین کی اکثریت نے ان کے کلام کو مرثیہ اور اخفین

غزل گو کے درجہ سے نکال کر مرثیہ گو بنا دیا ہے۔ جیسا کہ خود بھی ایک جگہ فرماتے ہین۔

مجھکو شاعر نہ کہو مصحفی ہون مرثیہ خوان　　سوز پڑھ پڑھ کے مجبون کو رُلا جاتا ہون

ان تمام باتون نے جمع ہو کر جذب و تاثیر کی وہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہ شعر ادھر زبان سے نکلتا ہے اور اُدھر دل کی گہرائی مین پیوست ہو جاتا ہے۔ گویا شیخ اور اُن کا کلام ملکر ایک ہو گئے ہین۔ اور کلام کو دیکھنے والا کبھی نہین کہہ سکتا کہ اُن کی عمر دکھ درد اور رنج و تکلیف کی سخت ترین منازل سے نہین گزری

اس ضمن مین وہ موقع سب سے زیادہ موثر، دلشکن اور طبیعت مین ہیجان پیدا کرنے والا ہوتا ہے کہ جہان خوشی و خرمی تو در کنار درد و غم بھی اس بہتات کے ساتھ نصیب نہین ہوتے کہ طبیعت سیر ہو سکے۔ اور طالب غم دل مسوس کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً

درد و غم کو بھی ہے مقدر شرط　　یہ بھی قسمت سوا نہین ملتا

واقعہ یہ ہے کہ یہی مضامین غزل گوئی کی جان ہین۔ اور جس شخص مین یہ مضامین جسقدر کثرت کے ساتھ پائے جائین اسیقدر کامیاب غزل گو خیال کیا جاتا ہے۔ یہی صفت ہے کہ جس نے میر تقی کو سرتاج شعرائے اُردو بنایا اور جسکی بنا پر خود شیخ مصحفی مرحوم صرف اپنے دور کے نہین بلکہ ہر دور کے شعرا مین ممتاز درجہ رکھتے ہین۔ اب ہم چند غزلین پیش کرتے ہین۔

نظرون مین تیری پیارے گو بیوقار تھے ہم　　اس پر بھی جان و دل سے خدمت گذار تھے ہم
دامان و جیب اپنا گریہ سے سب چمن تھا　　تو سیر کو نہ آیا ابر بہار تھے ہم
آتے تھے پاس تیرے جو دوڑ دوڑ ہمدم　　کمبخت دل کے ہاتھون بے اختیار تھے ہم
صیدِ زبون سے اپنے کیون تو نے منہ کو موڑا　　اس پر بھی کام کے تھے لاغر ہزار تھے ہم
اے مصحفی تصور اُس کا جو بندھ گیا تھا　　با صد ہزار حسرت شب ہم کنار تھے ہم

دیکھ اُسکو اک آہ نے ہم نے کر لی　　حسرت سے نگاہ ہم نے کر لی
کیا جانے کوئی کہ گھر مین بیٹھے　　اس شوخ سے راہ ہم نے کر لی
جب اُس نے چلائی تیغ ہم پر　　ہاتھون کی پناہ ہم نے کر لی
نخوت سے جو کوئی پیش آیا　　کج اپنی کلاہ ہم نے کر لی
دی ضبط مین جب کہ مصحفی جان　　شرم اُس کی گواہ ہم نے کر لی

مری حالت سے جا کر یون کرے اُسکو خبر کوئی　　کہ روتا ہے کھڑا تیرے لئے بیرون در کوئی
گیا مین اُسکی محفل مین تو وہ دربان سے یون بولا　　یہ مجلس ہے کہ میلا، جو چلا آتا ہے ہر کوئی

خدایا صبر دے دل کو کہان تک راہ مین اُسکی
دھرے زانو پہ سر بیٹھا رہے دو دوپہر کوئی

صبا گر جائے تو خلوت مین اس سے اتنا کہدینا
ترے کوچہ سے غافل کر گیا شب کو سفر کوئی

مرا مرنا ہی بہتر ہے صنم تا تو بھی یہ جانے
کہ دو دن کی جدائی مین گیا جی سے گذر کوئی

ہوا تو مصحفی بے جان مگر اے وائے تنہائی
سر بالین نہ آیا اُسکی شب بھر نوحہ گر کوئی

شب ہجران تھی مین تھا اور تنہائی کا عالم تھا
غرض اس شب عجب اک بے سر وپائی کا عالم تھا

شمع پر پروانہ شب جس وقت جل کر رہ گیا
دیکھ کر مین اُسکو اپنے ہاتھ مل کر رہ گیا

بن دیکھے جس کے پل مین آنکھین بھر ائیان ہون
کیا قہر ہے کہ اُس سے برسون جدائیان ہون

اے شب ہجر کہین تیری سحر ہے کہ نہین
نالۂ نیم شبی تجھ مین اثر ہے کہ نہین

گھر کا دروازہ جو ہم صبح کو وا کرتے ہین
شام تک تیری ہی بس راہ تکا کرتے ہین

ہے غریبی مین خبر کس کو وطن والون کی
کیا گرفتار سے پوچھو ہو چمن والون کی

کبھو تک کے در کو کھڑے رہے کبھی آہ بھر کے چلے گئے
ترے کوچے مین جو ہم آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے

لوگ کہتے ہین محبت مین اثر ہوتا ہے
کون سے شہر مین ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے

کس نے رکھے تھے قفس اُن پہ گرفتارون کے
کانٹے کیون سُرخ ہین سب باغ کی دیوارون کے

نہ کہین صبح ہی ہوتی ہے نہ خواب آتا ہے
رات کیا آتی ہے اک سر پہ عذاب آتا ہے

کب اس طرف وہ بت کج کلاہ آتا ہے — گدا کے گھر بھی کہین بادشاہ آتا ہے

میر صاحب کی چوتھی خصوصیت کے بارے مین آزاد کہتے ہین کہ

"ان کی غزلین ہر بحر مین کہین شربت اور کہین شیر و شکر ہین مگر چھوٹی چھوٹی بحرون مین فقط آبِ حیات
بہاتے ہین۔ جو لفظ منہ سے نکلتا ہے تاثیر مین ڈوبا ہوا نکلتا ہے۔ مگر یہ بھی بعض بزرگون سے معلوم ہ
کہ مشاعرے یا فرمایش کی غزلین ایسی نہ ہوتی تھین۔ جیسی کہ طبع زاد طرح مین ہوتی تھین۔ (آ ا
شیخ مصحفی مرحوم کی بھی جو غزلین بحرِ خفیف مین ہین ان کے رنگ شاعری کو اور زیادہ واضح ک ب حیات صفحہ ۲۱۲)
لفظ آئینہ ہے اور یہ تمام آئینے اس حسین ترکیب و ترتیب سے رکھے گئے ہین۔ کہ ذرا سی ٹھیس رہی ہین۔ ان کا ایک ایک
احتمال ہوتا ہے۔ اگر میر تقی مرحوم کی غزلون کو صرف آب حیات کی نہرین کہا جا سکتا ہے ت ...بل جانے سے ٹوٹ جانے کا
غزلین اپنی تازگی اور صفائی میں سلسبیل و کوثر سے جا ملتی ہین د شیخ مصحفی مرحوم کی چھوٹی چھوٹی
صاحبِ آبِ حیات نے اپنی تصنیف مین شیخ مرحوم کی ان بیش بہا اور ق ...یتی غزلون کے متعلق ایک حرف بھی نہین لکھا
تو ہمین اسکا افسوس نہین کیونکہ جیسا کہ ابتک ثابت کیا جا چکا ہے۔ آ ...پ حیات مین جسقدر تعریف یا تعریض کی ہے وہ
کسی واقفیتِ فن کا نتیجہ نہین ہے۔ بلکہ یون ہی ایک کی محبت او ...دوسرے کی عداوت کے جوش و خروش مین جو الفاظ
زبان قلم پر آ گئے ہین بے تکلف ادا کر گئے ہین
ان کی خاموشی سکوت سخن شناس نہین ہے ال ...بنہ ان کی تعریف تحسین ناشناس ضرور ہے۔ اسلئے ہم خوش ہین کہ
شیخ مصحفی کے چند پارہائے جگر ایک ناشناس ک ...حسین کے تیرون سے محفوظ رہ گئے ورنہ ان کی قیمت کم ہو جاتی
آبِ حیات مین جو مسلک تمام جذ ...بات گو شعرا کے لئے جائز رکھا گیا ہے اس سے یہ اُمید نہین پڑتی۔ کہ آزاد
ان خوبیون کو عمداً نظر انداز کر گئے اگ ...ان کی نظر پہنچ جاتی تو اپنی مسلّمہ فطرت کی بنا پر بگاڑ سنوار کر کہنے اور جا بجا جلی کٹی
سنانے مین کوتاہی نہ کرتے اور نہد ...معلوم کن الفاظ مین باکمال مگر غریب الوطن مصحفی پر پھبتیاں اُڑائی جاتین۔ البتہ یہ
کہا جا سکتا ہے کہ اُن کا تیر نشا ...پر نہ بیٹھا۔ اور نگاہ غلط انداز سے ایک ایسی غلطی ہو گئی۔ جو حلقۂ احباب مین عرصے تک سرگوشیون کا
سبب بنی رہیگی۔ چند غز ...ہین اور ملاحظہ ہون:-

مین خستہ تمام ہو چکا اب — جا درد کہ کام ہو چکا اب
زلفون مین پھر اُس نے منہ چھپایا — بس وعدۂ شام ہو چکا اب
میر شبِ ماہ یار تک تھی — لطفِ لبِ بام ہو چکا اب
دربار ہو یا نہ ہو غرض کیا — اپنا تو سلام ہو چکا اب

رکھا تہِ خاک مصحفی کو آرام تمام ہو چکا اب

یون چلتے ہین لوگ راہ ظالم یہ چال ہے کون آہ ظالم
غیرون کو تو روز دیکھتا ہے مجھ پر بھی کوئی نگاہ ظالم
کس کس کو ملے گی حشر مین داد اک خلق ہے داد خواہ ظالم
کہدے کوئی جا کے مصحفی سے ہوتی ہے بُری یہ چاہ ظالم

کیا کرین جا کے گلستان مین ہم آگ رکھ آئے آشیان مین ہم
مر کے نکلے قفس سے خوب ہوا تنگ آئے تھے اس مکان مین ہم
شاخِ گُل کے گلے سے مل مل کر روتے ہین موسم خزان مین ہم
مصحفی عشق کر کے آخرکار خوب رسوا ہوئے جہان مین ہم

ایک ایک شعر بے مثل ہے

اپنے مژگانِ رخنہ گر کو دیکھ آن کر پھر مرے جگر کو دیکھ
میرے آگے نہ دیکھ آئینہ میری حسرت بھری نظر کو دیکھ
دیکھتا کیا ہے عقد پر دین کا اپنے آویزۂ گہر کو دیکھ
تھی شبِ وصل کھل گئی جب آنکھ رنگ فق ہو گیا سحر کو دیکھ
مصحفی یہ ستم نکر نادان خط نہ دے اپنے نامہ بر کو دیکھ

بیٹھ کر وہ جہان سے اُٹھتا ہے ایک فتنہ وہان سے اُٹھتا ہے
نالہ کرتی ہے جس گھڑی بلبل شعلہ اک آشیان سے اُٹھتا ہے
جم کے جو سنگ کی طرح بیٹھا کب ترے آستان سے اُٹھتا ہے
مصحفی ضبط آہ کر ورنہ پردہ رازِ نہان سے اُٹھتا ہے

غم دل کا بیان چھوڑ گئے ہم یہ اپنا نشان چھوڑ گئے
چلتے چلتے بھی یہ جفا کیشان ہاتھ مجھ پر ندان چھوڑ گئے

صفحۂ روزگار پر لکھ کر — عشق کی داستان چھوڑ گئے
راہ مین مجھ کو میرے ہمراہی — جان کرنا توان چھوڑ گئے
لے گئے سب بدن زمین مین ہم — مصحفی اک زبان چھوڑ گئے

الغرض زبان کی سلاست بیان کی دلآویزی اور خیالات کی واقعیت مین میر صاحب اور شیخ صاحب مین صرف یہی امتیاز ہے کہ میر صاحب متقدم ہونے کے سبب سے افضل سمجھے جاتے ہین اور شیخ صاحب مقلدین کے گروہ مین آکر آگے بڑھنے سے رہ گئے ہین۔ اسی بنا پر مولانا حسرت موہانی نے فیصلہ کیا ہے کہ بحیثیت مجموعی مصحفی کا کلام میر سے دوسرے درجے پر ہے

آزاد صاحب کی منطق یہان بھی دنیا سے نرالی ہے کہتے ہین

"اسی کوچے مین اکثر شعر میر صاحب کے بھی جھلک دکھاتے ہین مگر جو اُن کے جوہر ہین وہ اُن ہی کے ساتھ ہین یہ اس ڈھنگ مین کہتے ہین۔ تو بھسنڈے ہو جاتے ہین (آب حیات صفحہ ۳۱۲)

ہم پوچھتے ہین کہ آخر میر صاحب کے جوہر کیا ہین زبان کے متعلق تو یہ ہے کہ خود آزاد نے اسی آب حیات مین اُن کو میر و سودا کا ایک آخری ہمزبان قرار دیا ہے۔ نیز ہم نے صفحات بالا مین مماثلت میر و مصحفی کی بنیاد جن اصول پر رکھی ہے وہ ان ہی کے بیان کردہ ہین اسکے بعد محاسن زبان کا قضیہ تو ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ اب رہے مضامین۔ پس اگر یہ فقرہ مضامین سے تعلق رکھتا ہے۔ تو اسقدر تشریح کے بعد بھی جس مین الفاظ و معنی اور زبان و بیان دونون کا لحاظ مساوی طور پر قایم رہا ہے ہم دس پانچ مثالیں مہیا کرنے مین بخل نہین برت سکتے ہمین تو دروغ گو را تا بخانہ رسانید۔ پر عمل کرنا ہے۔ اور محض یہ دکھانا ہے کہ میر تقی کے انداز مین کوشش کرتے ہوئے شیخ مصحفی بھسنڈے ہو کر رہ گئے ہین یا آزاد نے محض تعصب اور ہٹ دھرمی سے کام لے کر اپنے نامۂ اعمال کی سیاہی مین اور اضافہ کر لیا ہے

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میر — پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا[1] (میر)
مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم — تیرے دل مین تو بہت کام رفو کا نکلا (مصحفی)

شیخ مصحفی مرحوم کے دونون مصرعے جسقدر برجستگی کے ساتھ زبان مین ڈوب کر نکلے ہین اسکا لطف بے تعصب اہل زبان اُٹھا سکتے ہین

اس بیکسی سے کون جہان مین موا کہ مین — جز داغ سینہ آج چراغ لحد نہین (میر)
داغ حسرت لے گئے دنیا سے بعد مرگ ہم — کون لاتا ہے غریبون کے سر مدفن چراغ (مصحفی)

میر صاحب کے شعر سے اول تو داغ کی توجیہ نہین ہوتی۔ دوسرے بادی النظر مین یہ معلوم ہوتا ہے کہ چراغ لحد اُس چراغ کا نام ہے جو لحد کے اندر جلے کیونکہ سینے کا داغ جو اُسکی نیابت کا حق ادا کر رہا ہے لحد سے باہر نہین ہو سکتا لیکن مصحفی مرحوم نے چراغ کو چراغ مدفن اور داغ کو داغ حسرت کہہ کر مضمون کو دونون لغزشون سے بچا دیا شیخ مرحوم کے شعر مین ایک مخفی پہلو اور لطیف کنایہ

---

[1] میرے نزدیک ان دون شعرون کا تقابل اصولاً درست نہین۔ (اڈیٹر)

بھی ہے کہ جب زندگی مین کسی نے توجہ نہ کی اور ہمین داغ حسرت لیجانا پڑا تو مدفن پر چراغ جلانیکی توفیق کسے ہو سکتی ہے۔ گور غریبان کی رعایت سے مرنے والون کو غریب کہنا لطف سے خالی نہین کاش آزاد انصاف سے کام لیتے اور شیخ مصحفی مرحوم کے حسن کلام کو جو مرنیوالے کی تربت کا چراغ ہو کر تحفظ نام و نشان کا سبب واحد تھا۔ اس طرح ناحق شناسی کے دامن کے سپرد کرنے سے پرہیز کرتے

امید وار وعدۂ دیدار مر چلے — آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا (میر)
مدت ہوئی کہ بیٹھے ہین ہم انتظار مین — کیا جانے آتے آتے قیامت کہان رہی (مصحفی)

میر صاحب کے دوسرے مصرع مین "یارو" ایک زائد لفظ[1] معلوم ہوتا ہے۔ نیز امیدوار وعدۂ دیدار کا مرجانا یا مرنے کے قریب پہونچ جانا جذبۂ محبت و مودت کے بالکل منافی ہے اسکے خلاف شیخ مصحفی کا پورا شعر روانی اور برجستگی کے قالب مین ڈھل کر نکلا ہے اور میر کے شعر سے زیادہ کیفیات کا حامل ہے

ہم فقیرون سے بے ادائی کیا — آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا (میر)
امیدِ کرم پر تری آتے ہین یہانتک — جس روز نہ دیکھینگے کرم بیٹھ رہینگے (مصحفی)

میر صاحب کے شعر مین بے ادائی ایک ایسا لفظ ہے جسکے معنی شعر کے لئے کچھ زیادہ مفید نہین کیونکہ ادا بمعنی کرم[2] جمہور کے خلاف ہے۔ نیز پیار[3] کرنا شان معشوق کے خلاف ہونیکی وجہ سے نامناسبت کا پہلو رکھتا ہے۔ البتہ شیخ مصحفی مرحوم کا شعر ہر لحاظ سے بلند تر ہے۔

وہ دشت خوفناک رہا ہے مرا وطن — سنکر جسے خضر نے سفر سے حضر کیا (میر)
جس بیابان خطرناک مین ہے اپنا گذر — مصحفی قافلے اُس راہ سے کم نکلے ہین (مصحفی)

میر صاحب کا دوسرا مصرع خضر سفر حضر تین متفق الحرکات کے الفاظ کے اجتماع سے ثقیل ہو گیا ہے۔ اور پہلے مصرعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دشت خوفناک کسی وقت وطن کی حیثیت رکھتا تھا۔ بحالت موجودہ اس سے کوئی تعلق نہین۔ لیکن شیخ مصحفی مرحوم کے شعر پر ایسا کوئی اعتراض وارد نہین ہوتا۔ بلکہ ایک اور لطیف پہلو یہ نکلتا ہے کہ مین جس خطرناک بیابان مین سرگرم سعی ہون اس راستے سے یکہ و تنہا آدمی تو کیا قافلون کو بھی قدم رکھنے کی ہمت نہین پڑتی

آزاد صاحب نظر ہوتے تو اندھیرے اُجالے کا جو فرق شیخ مصحفی اور خواجہ آتش کے کلام مین نظر آیا میر صاحب و شیخ صاحب کے کلام مین زیادہ آسانی کے ساتھ نظر آسکتا تھا

جون صبح اب کہان ہے طول سخن سے فرصت — قصہ ہی کوئی دم کو ہے مختصر ہمارا (میر)
شمع سحری ہین نہین کچھ عمر کو وقفہ — یان کام ہے اپنا تو تمام ایک نفس مین (مصحفی)

میر صاحب کا شعر طول و مختصر کی صنعتِ تضاد کے سوا کوئی خاص خوبی نہین رکھتا۔ بلکہ انسان فانی کو صرف سحر کے ساتھ

---

[1] ہرگز زاید نہین (اڈیٹر) [2] میر نے ادا بمعنے کرم کب استعمال کیا ہے۔ بے ادائی یہ معنے بے رخی آیا ہے۔ (اڈیٹر)
[3] پیار کرنا اس معنی مین نہین ہے جو صاحب مضمون نے سمجھا ہے (اڈیٹر)۔

تشبیہ دیئے جانے کی وجہ سے ایک حد تک قابل اعتراض بھی معلوم ہوتا ہے۔ یہ مضمون بھی شیخ مصحفی مرحوم کے حصّے کا ہو گیا شمع سحری کہکر ایک نفس مین کام تمام کرنا کس قدر لطف آمیز ندرت ہے

سعیِ طوفِ حرم نہ کی ہم نے آستان پر ترے مقام کیا (میر)
کیا غرض تھی طرف دیر و حرم کیون جاتے اسکے کوچہ مین ہمین عمر بسر کرنا تھا (مصحفی)

شاعرانہ طور پر طلب حق کے دو راستے مانے جاتے ہین ایک دیر دوسرا حرم لیکن عاشقان صادق ان جھگڑون مین پڑنا پسند نہین کرتے بلکہ براہ راست اپنے مطلوب کے آستانِ ناز پر زندگی بسر کرنے کو عین طاعت و عبادت خیال کرتے ہین یہی مضمون ہے جو دونون کے یہان بیان ہوا ہے لیکن شیخ مصحفی کا طرز بیان زیادہ مدلّل۔ زیادہ واضح اور زیادہ محیط ہے "کیا غرض تھی" اس جملے مین دیر و حرم سے بے تعلقی ظاہر کرنے کا جو زور ہے وہ "سعیِ طوفِ حرم نہ کی" سے پیدا نہین ہو سکتا۔ اور "اس کوچہ مین ہمین عمر بسر کرنا تھا" اس مصرع نے عاشق کے جس طور زندگی کی قید کر دی۔ وہ میر صاحب کے دوسرے مصرعہ کے مقابلے مین کہین بڑھ چڑھکر ہے نیز صرف حرم پر اکتفا نہ کر کے دیر و حرم دونون کو نظر انداز کر دینے کا مسئلہ بھی خصوصیت کے ساتھ دیکھنے کے قابل ہے۔ غرض ہر جہت سے شیخ مصحفی کا شعر بلند ہے۔ مگر افسوس یہ بلندی آزاد کی نگاہ مین پستی کی ہم معنی ہے

طالع جو خوب تھے نہ ہوا جاہ کچھ نصیب سر پر مرے کرور برس تک ہما پھرا (میر)
دیا ہے مجھ کو یہ برگشتہ طالعی نے اثر کہ آکے سر پہ میرے سایۂ ہما پھر جائے (مصحفی)

میر صاحب کے شعر مین "طالع جو خوب تھے" ثقیل انداز بیان ہے۔ "کرور برس تک" مبالغہ ہے اور مبالغہ بھی کرجس سے طوالت وقت کے سوا کچھ منظور نہین "ہما پھرا" ایسے برے پہلو سے نظم کیا گیا ہے کہ اصلی معنی بھی خاک مین مل گئے۔ برخلاف اس کے شیخ مصحفی کا شعر ہر لحاظ سے بلند ہے۔

کیا رکھا کرتے ہو آئینہ سے صحبت ہردم ٹک کبھو بیٹھو کسو طالب دیدار کے پاس (میر)
میرے آگے نہ دیکھ آئینہ مری حسرت بھری نظر کو دیکھ (مصحفی)

میر صاحب کا شعر زبان کے لحاظ سے کچھ زیادہ صاف اور ترکیب کے لحاظ سے کچھ زیادہ برجستہ نہین پھر اسمین وہ بیتابی اور بیقراری بھی نہین پائی جاتی جو شیخ مصحفی مرحوم کے شعر کا اصلی جوہر ہے۔ معشوق نہین معلوم کس خیال سے عاشق کے سامنے آئینہ بینی مین مصروف ہو جاتا ہے۔ عاشق اس بات کو گوارا نہین کر سکتا کہ اسکی موجودگی مین کوئی دوسری ہستی دیدار یار سے فیض یاب ہو۔ اور نہایت بیتابی کے ساتھ محو آرائش معشوق سے کہتا ہے کہ او ظالم تو میرے سامنے آئینہ کیون دیکھتا ہے اس وقت تو میری حسرت بھری نظر کو دیکھ۔ تیرا مطلب اسی سے پورا ہو سکتا ہے۔ حسرت بھری نظر کو دیکھنے کے دو مقصود ہین۔ ایک تو یہ کہ حسُن کی قدر کرنا اہل نظر کا کام ہے۔ دوسرے یہ کہ صاحب حسُن اپنے حسُن کے اوصاف آئینہ دیکھکر معلوم نہین کر سکتا اس کے لئے پھر کسی حسرت بھری نظر کی ضرورت ہے۔

ربط صاحب خانہ سے مطلق بہم پہونچا نہ میر　　مدتون سے ہم حرم مین تھے پہ نامحرم گئے　　(میر)

ابتک حرم وصل سے محرم نہ ہوئے ہم　　کعبہ مین حجاب در و دیوار غضب ہے　　(مصحفی)

دونون کے یہان تصوّف کا ایک مسئلہ نظم ہوا ہے - میر صاحب کہتے ہین کہ ہم ایک مدت سے حرم مین تھے، لیکن صاحب خانہ سے مطلق ربط پیدا نہ ہو سکا۔ آخر کار نامحرم ہی جانا پڑا اول تو یہان ربط پیدا نہ ہونیکی کوئی وجہ ظاہر نہین کی گئی - دوسرے حصول مقصد سے پہلے منزل کوشش و سعی سے قدم اُٹھا لینا حقیقی جذبۂ محبت کے منافی ہے اس کے خلاف شیخ مصحفی کے الفاظ و معنی بجائے خود مستقل ہین صاحب خانہ کے بجائے حرم سے محرم نہ ہونا کسی دوسری دنیا مین پہونچا دینے والا جملہ ہے - دوسرا مصرعہ جس تیور سے ادا ہوا ہے - اُس نے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہین رکھی - اور صاف ثابت کر دیا کہ مجردات تک رسائی حاصل کرنے کیلئے مادیات کا سہارا لینا خوفناک غلطی ہے - حجاب در و دیوار ایک ترکیب ہے - منجملہ ان خوشگوار ترکیبون کے جو شیخ مصحفی کے کلام مین اکثر پائی جاتی ہین

یہ چند مثالین اس بات کا ثبوت دینے کے لئے کافی ہین - کہ میر صاحب اور شیخ صاحب کے میدان شاعری اور حدپرداز تخیل مین ذرہ بھر تفاوت نہین حالانکہ آزاد حب الوطنی کے جوش یا خدمت بزرگانِ خاص کے شوق مین غریب الوطن اور بیکس مصحفی کو میر تقی کے مقابلہ مین نہین بلکہ بعض چھوٹے درجے کے شعرا کے سامنے بھی ذلیل کرنے کی کوشش کرتا ہے حیرت ہے

شاید آزاد کا یہ خیال ہو کہ میر صاحب کے کلام کی بندشین چست اور ترکیبین درست ہین اور شیخ مصحفی مرحوم کا کلام ان اوصاف سے خالی ہے تو ہم چند ہم قافیہ اشعار درج کر کے حسن و قبح کا فیصلہ اہل نظر پر چھوڑتے ہین

درہمی حال کی ہے سارے مرے دیوان مین　　سیر کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا　　(میر)
ہوش اڑ جائینگے او زلفِ پریشان تیرے　　لب پر آیا جو مرے ذکر پریشانی کا　　(مصحفی)

وہ بھی جانے کہ لہو رو کے لکھا ہے مکتوب　　ہم نے سرنامہ کیا کاغذ افشانی کا　　(میر)
ہم اسیرون کو قفس مین نہ ملا لطفِ فراغ　　شوق جی ہی مین رہا بال و پر افشانی کا　　(مصحفی)

شرمندہ ترے رُخ سے ہے رخسار پری کا　　چلتا نہین کچھ آگے ترے کبک دری کا　　(میر)
مردون کو جلاتی ہے ترے پاؤن کی ٹھوکر　　اس چال پہ مرنا ہے بجا کبکِ دری کا　　(مصحفی)

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت　　اسباب لُٹا راہ مین یان ہر سفری کا　　(میر)

کیا لطفِ مقام اُن کو جو مشتاق عدم ہین دل کوچ مین رہتا ہے ہمیشہ سفری کا (مصحفی)

کیا کہئے آہ جی کو قیامت ہے انتظار آتا نہ کاش وعدۂ دیدار درمیان (میر)
ہم روئے عیش دیکھ چکے روز حشر بھی یون ہی رہا جو وعدۂ دیدار درمیان (مصحفی)

دفتر نہین کہانی نہین مثنوی نہین کیا شرح سوز عشق کرون مین زبان نہین (میر)
اسکا یہی سبب ہے جو گرم فغان نہین اپنا تو اس چمن مین کوئی ہمزبان نہین (مصحفی)

عبارت خوب لکھی شاعری انشا طرازی کی وے مطلب ہی کم دیکھین تو کیا ہووے مدعا حاصل (میر)
کسی نے کرلیا معلوم رازِ دل تو کیا حاصل مزا جب ہے کہ ہو چکیے ہی چکیے مدعا حاصل (مصحفی)

زمین پر مین جو پھینکا خط کو کر بند بہت تڑپا کیا جون مرغِ پر بند (میر)
مرے سینے مین دل بیتا بیون سے پھڑکتا ہے مثالِ مرغ پر بند (مصحفی)

افسر امروہوی

تذکرۂ خندۂ گل

ظریف شاعرون کا تذکرہ

جس مین ۳۰۰ سو سے زاید اردو، فارسی کے ظریف شاعرون کے حالات، انکے لطایف وظرایف اور انتخابات کلام درج ہین۔ یہ کتاب اردو مین اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل اچھوتی چیز ہے اور ہر صاحب ذوق کی لائبریری مین اسکا رہنا ضروری ہے۔ تنہائی مین اس سے بہتر مونس، حالت غم مین اس سے زیادہ کامیاب ذریعۂ تفریح اور اہل تحقیق کے لئے اس سے زیادہ مواد اس موضوع پر اور کہین نہین مل سکتا

حجم تقریباً ۵۰۰ صفحات (قیمت مع محصول ڈاک للعہ) مینجر "نگار" لکھنؤ

سیاح کی ڈائری

(موجودہ اکابر لکھنؤ)

اس سے قبل میں جب کسی کا شعر سنتا تھا، تو اپنے تاثر یا شعر کے اثر کے لحاظ سے شاعر کی ایک ذہنی تصویر قائم کر لیتا تھا اور جب تک سکو دیکھ نہ لیتا، اسی خیالی صورت کے ساتھ ساتھ اس کے کلام کا مطالعہ کرتا تھا، لیکن جب بعد کے تجربات نے ثابت کیا کہ ہندوستان کا شاعر اپنے "عالم شعر" سے بالکل علحدہ چیز ہوتا ہے اور اس کے اقوال سے کبھی اس کے حال و اعمال پر صحیح حکم نہیں لگایا جا سکتا، تو میں نے اس اصول پر کاربند ہونا ترک کر دیا اور دوسرا اصول بالکل اس کے خلاف یہ قائم کیا کہ سب سے اچھا شاعر سب سے بُرا انسان ہے"۔ ہر چند اس اصول کی بھی صحت پر مجھے وثوق تام نہیں ہے، لیکن یہ اتنا غلط بھی نہیں ہے، کیونکہ اگر سب سے اچھا شاعر سب سے بُرا انسان نہیں ہوتا تو کچھ ایسا زیادہ دلکش و پسندیدہ چیز بھی نہیں ہوتا کہ اس اصول کو کلیۃً غلط قرار دے دیا جائے۔

اول اول جب میں نے کلام اقبال کا مطالعہ کیا تو ان کے خیال کی رفعت اور جذبات کی اثیریت کو سامنے رکھ کر جو صورت میں نے اُن کی قایم کی، یہ تھی:-

ایک نحیف الجثہ انسان (دماغی ترقی اور صحت جسمانی دونوں کا اجتماع کبھی میرے ذہن میں نہیں آتا) بڑی چمکیلی آنکھیں، داڑھی اگر ہوئی تو بالکل "مسترسل الشعر" قسم کی ورنہ چار ابرو کا صفایا۔ ہنستے کم ہوں گے لیکن باریک جلد کے نیچے ایک خاص قسم کا نورانی خندہ ہر وقت جھلکتا ہوگا، معاشرت نہایت سادہ مگر پاکیزہ ہوگی، بلحاظ اخلاق کے یکسر عجز و فروتنی ہوں گے، بات بات پر آنکھیں اشک آلود ہو جاتی ہوں گی اور بہ حیثیت مجموعی ان میں ایک ایسی کشش ہوگی کہ انسان خود بخود ان کی طرف کھنچ جاتا ہوگا، لباس بالکل مشرقی وضع کا ہوگا اور عنایش سے بالکل دور"

لیکن جب میں ان سے ملا تو مجھے کس قدر تکلیف ہوئی کہ وہاں ایک بات بھی میرے مزعومات کے مطابق نہ تھی۔ میں کبھی یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ شلوار پہنتے ہوں گے جو مرد کے لئے سد درجہ غیر شاعرانہ ملبوس ہے اور اونچا کوٹ جو پنجابی یونیفارم کا جزو غیر منفک ہے، استعمال کرتے ہوں گے، جسے کم از کم فلسفیانہ ذہنیت کا انسان کبھی پسند نہیں کر سکتا، ہر چند یہ ضروری نہیں کہ معمولی گفتگو بھی ایک شاعر کی شاعرانہ دلکشی رکھتی ہو، لیکن اس کا تو وہم بھی کبھی نہ گذرا تھا کہ وہ قیام کو کیام اور قہقہہ کو کہکہہ بولتے ہوں گے۔

وہ مجھ سے گفتگو کر رہے تھے اور میں حیران تھا کہ خدایا یہ اقبال دفعۃً اکبال کیسے بن گیا۔ آنکھیں چھوٹی اور بہت چھوٹی، جسم پہلوانی کے لگ بھگ فربہ و تربیت یافتہ، حقہ (حُکّہ) کے غیر لطیف و کثیف استعمال کی کثرت سے کمرے کی ساری فضا بدبو سے لبریز، چہرہ کی ساخت نقشہ کی قطع برید یکسر غیر دلچسپ اور عوایہ میں کوئی دلکشی نہیں ——

اس کے بعد بھی جب میں کسی شاعر یا بڑے انسان سے ملا تو سوائے ایک ٹیگور کے کہ وہ تو بیشک وہی نظر آیا جیسا میں نے سمجھا تھا، اور نہ سب کے

ہمیشہ اپنی ذہنی تصویر سے اس کو بالکل مختلف پایا، اور آخر کار میں نے قصد کر کے اپنی ذہنی مصوری کے اصول کو بدلدیا۔ اور آئندہ کے لئے یہ عہد کیا کہ جب کبھی کسی کا شعر سنوں گا، تو کبھی یہ جاننے کی کوشش نہ کروں گا کہ اس کا کہنے والا کون ہے، اور اگر یہ جاننے کے بعد میں، کوئی تصویر قائم کرونگا بھی تو بالکل اپنے تاثرات کے خلاف۔

لکھنؤ آنے سے قبل میں یہاں کے مشہور شعرا کا کلام دیکھ چکا تھا اور ان کی شکل و صورت، عادات و اخلاق کے متعلق بھی ایک حکم لگا چکا تھا، اس لئے میں بے چین تھا کہ کسی طرح ان سے ملوں، ان کی زبان سے ان کا کلام سنوں اور پھر اس کے مطابق اپنے "ذہنی مرقع" کی صحت کروں۔ یہاں آنے سے پہلے ہی میں ایک خیالی فہرست مرتب کر چکا تھا کہ مجھے کیا کیا دیکھنا ہے اور کس کس سے ملنا ہے، چنانچہ میں اپنے ذہن کی رفتار کے لحاظ سے جس کی کوئی وجہ نہیں بتا سکتا، بغیر رعایت حروف تہجی کے حسب ذیل اسمار کی فہرست تیار کر چکا تھا

چھتر منزل۔ صفی۔ بٹیروں کی پالی۔ عزیز۔ محشر۔ آرزو۔ قیصر باغ۔ جالب۔ رحم علی ہاشمی۔ ممتاز حسین۔ عروج۔ آصف الدولہ کا امامباڑہ ناطق۔ احسن۔ بیلی گارد۔ ثاقب۔ نولکشور پریس۔ آسی۔ افسر۔ خان بہادر علین الدین سی مجسٹریٹ۔ فرنگی محل کا پل، کپتان کے کنوئیں کی برفی، اور تحسین کی مسجد۔ جیسا کہ آگے چلکر معلوم ہوگا، اس فہرست میں بعد کو بہت کچھ حذف و اضافہ ہوا، لیکن میرے خیال کی جولانگاہ اول اول یہی تھی جو فہرست بالا سے ظاہر ہوتی ہے۔

صبح اول وقت میں اس ارادہ کی تکمیل کے لئے نکلنے ہی والا تھا کہ وہی پارک والے "لقیط"[1] قسم کے دوست آگئے اور انہوں نے حدیقۃ الحیوانات کا ذکر کر کے جسے یہاں بنارسی باغ کہتے ہیں میری فہرست میں ایک نام کا اضافہ اور کر دیا۔ صبح کا وقت تھا، موسم بھی خوشگوار تھا، اس لئے انکی رہبری میں حضرت گنج کی مغربی معاشرت کی آبادی سے گزرتا ہوا اس وسیع مقام پر پہونچ گیا، جو بیک وقت مرغزار بھی ہے اور صحرا بھی، باغ بھی ہے اور خشک میدان بھی، وحوش وطیور کو ان کی طبعی حالت پر دیکھنے کا مجھے بہت شوق ہے اور ہر چند انسانی گرفت میں آنے کے بعد ان کی حقیقی وحشت درندگی باقی نہیں رہتی، لیکن یہاں بڑی حد تک آزادی کے اسباب فراہم کئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ شیروں کے لئے بھی تنگ کٹہرے کے ایک وسیع حصہ کو آہنی سلاخوں کے حصار سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ جہاں ان کے لئے نیستان، کوہستان اور پانی کے حوض بنا دئیے گئے ہیں۔ یہاں کا سب سے زیادہ رومانی حصہ وہ قطعۂ زمین ہے جہاں یوکلپٹس کے سرو آسا کلہ افگن بلندی کی حد تک پہونچنے والے درختوں کا مختصر سا جنگل تھوڑی دیر کے لئے انسان کو تہذیب و تمدن کے تمام دل و دماغ تھکا دینے والے جذبات سے علحدہ کر کے ایک ایسی معصوم دنیا میں پہونچا دیتا ہے جہاں بغیر کسی معشوق کی موجودگی کے عشق کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔

جب دھوپ تیز ہونے لگی اور واپس آنے کا خیال کیا تو میرے رہبر مجھے سنگ مرمر کی اس خوبصورت و خنک بارہ دری میں لے گئے، جہاں کسی وقت یہاں کے فرمانروا بیٹھتے ہوں گے لیکن اب صرف باغ کے مالی رونق افروز رہتے ہیں۔ یہیں ان کے دو دوست اور ملگئے جو اتفاق سے دونوں میرے یہاں درج رجسٹر تھے۔ ان کو میں اس وقت تک صرف آسی اور افسر کے نام سے جانتا تھا، اور میں نہیں چاہتا تھا کہ انکا اصلی نام مجھ کو بتایا جائے، لیکن آرزو سے تقدیر نہیں پھرتی اور آخر کار ان دونوں کے نام (عبد الباری، اور حامد اللہ) جو غیر معمولی طور پر غیر شاعرانہ

[1] لقیط عرب میں اس بچہ کو کہتے ہیں جو کہیں اتفاق سے پڑا ہوا ملجائے۔

واقع ہوئے ہیں مجھے بتا ہی دیئے گئے۔ یہ گویا پہلا شگونِ بد تھا جو جانوروں کے مطالعہ سے فارغ ہونے کے بعد ان دو ثقیل اور سامعہ شکن نام رکھنے والے شاعروں کی صورت میں ظاہر ہوا ——— جناب آسی دوہرے بدن کے آدمی ہیں لیکن ادائیں ان کی سب اکہری ہیں (اکہری کا لفظ میں نے سادہ اور غیر مصنوعی کے معنے میں استعمال کیا ہے) خندہ[۵۱] رُو، تبسم لب، قہقہہ پیشانی (گھوڑے کا ستارہ پیشانی ہونا اور بات ہے) انسان ہیں، آنکھوں میں شرارت آمیز حیا، چتون میں ہلکی سی متانت آغشتہ شوخی، رفتار میں خفیف سی لچک آسا بکی، اور گفتار میں ہلکی سی شکریں حلاوت، سبھی کچھ ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی دیکھنے والے پر جو اثر پیدا ہوتا ہے اُسے ہم صرف "حلزویت[۵۲]" سے تعبیر کر سکتے ہیں، جو ممکن ہے ان کی انتہائی سادگی و نیکی کا انعکاس ہو۔ قیافۃً فی الجملہ ذہین ہے، لیکن نگاہیں دور رس نہیں معلوم ہوتیں۔ ضلع میرٹھ کے رہنے والے ہیں اور سولہ سترہ سال سے لکھنؤ میں بسلسلۂ ملازمت مقیم ہیں۔ باوجودیکہ تقریباً ربع صدی سے لکھنوی شعرا کے ہجوم میں اور لکھنوی شاعری کی محافل میں زندگی بسر کر رہے ہیں، لیکن ان کی شاعری کسی طرح یہاں کی آب و ہوا سے متاثر نہیں ہوئی اور ان کی غزلیں ان جذبات بلند کی حامل ہوتی ہیں جو یقیناً ان کی کاروبار زندگی و مشاغل حیات کو دیکھتے ہوئے حیرت میں ڈالدینے والی ہیں۔ لکھنؤ کے عام رواج کے مطابق یہ بھی غزل گا کر فرماتے ہیں، ہر چند اپنے پندار میں وہ بہت زبردست موسیقی پیدا کرتے ہیں اور آواز میں بھی وہ نزاکت پیدا کرنا چاہتے ہیں جو "دشنام یار" کو بھی "طبع حزیں" پر گراں نہ گذرنے دے، لیکن قدرتی محرومی کا کیا علاج کہ نہ مردانہ لب و لہجہ باقی رہتا ہے نہ نسائی غنا پیدا ہوتا ہے اور اس لئے جس حد تک پڑھنے کا تعلق ہے غزل بالکل مخنّث ہو کر رہ جاتی ہے۔ عام شعراء کی طرح انہیں اپنا کلام سنانے کی ہوس نہیں ہے، اس لئے میرے اصرار پر چند مختلف اشعار انہوں نے سنائے جن میں سے بعض مجھے اب بھی یاد ہیں۔

افسر میرٹھی ایک پستہ قد انسان ہیں اور غالباً فطرت کے مقصود کو شرمندہ کرنے والے نہیں ہیں۔ ایک قیافہ شناس کے لئے ان کے چہرہ کی ساخت اور اس کے خطوط میں کافی سامان مطالعہ مل سکتا ہے ۔ میں صرف اس قدر سمجھ سکا کہ سرسری ملاقات میں ان کو سمجھ کر مطمئن ہو جانا خطرہ سے خالی نہیں۔ ان کی شگفتہ روئی اگر وہ واقعی عوائد رسمیہ کی بنا پر ہو تو صحرا کے سراب سے زیادہ نہیں، لیکن ان کا وہ خندۂ بے اختیار بھی نہیں چھپتا، جب ان کا دل صداقت کے ساتھ اس پر مجبور کرے۔ بعض کا خیال ہے کہ ان کی آنکھیں فریدی قسم کی ہیں، یعنے ایک چھوٹی اور دوسری بڑی، لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ رقبہ کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں، البتہ ایک کی ساخت مدور ہے اور دوسری کی مستطیل، اور اس طرح گویا اہرمن و یزدان دونوں ہر وقت ان کھڑکیوں سے جھانکتے رہتے ہیں۔ چونکہ میں ان کی بائیں جانب یعنے ان کے یزدانی حصۂ دماغ کی طرف تھا اس لئے مجھے ان کی اہرمنی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں پڑا۔ آدمی بہت سلجھے ہوئے ہیں، اور کافی غور کے بعد کسی نتیجہ پر پہونچنے کے عادی ہیں۔ ان کی شاعری بڑی حد تک "شب پرستانہ" قسم کی ہے مگر "شب رو" نہیں، آسمان ستارے، کہکشاں، چاند، ان کے ذرائع پیام رسانی ہیں، اور مقصود شاعری "درسِ حیات"۔ ٹیڑھی میڑھی بحروں میں، ٹوٹے ٹوٹے شعر لکھنا ان کا خاص ذوق ہے، جس سے

---

۵۱ اصل میں یہ لفظ خنداں رُو ہے لیکن اکثر خندہ رُو لکھتے ہیں اور اسی کو سامنے رکھ کر باقی دو لفظ اختراع کئے گئے ہیں۔

۵۲ میں نے قصداً عربی کا نہایت ثقیل لفظ استعمال کیا ہے اگر کوئی شخص اس کا مفہوم جاننا چاہتا ہے تو لغت سے مدد لے

بعض جگہ "انجیلی" (Biblical) کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ تغزل میں ان کی جذبات نگاری کے بعض شعر میں کبھی نہیں بھول سکتا

واپسی کے وقت نولکشور پریس میں مرزا محمد عسکری بی۔ اے اور پریم چند کی زیارت ہوئی۔ مرزا صاحب یہاں کے شعبۂ اردو کے مہتمم ہیں اور باوصف ضعف و پیرانہ سالی کے پوری جوانانہ سرگرمی کے ساتھ تحریر و مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں۔ آپ کا آخری علمی کارنامہ "تاریخ ادب اُردو" ہے جو تقریباً ۹۰۰ صفحات کو محیط ہے۔ لکھنؤ میں مسلم اکاڈیمی کا وجود آپ ہی کی ذات سے قائم ہے، کیونکہ نہ آپ ہر ماہ اپنے مکان پر ممبروں کو پر تکلف دعوت دیں اور نہ کوئی شرکت کے لئے مجبور ہو۔ ارادہ ہے کہ محض لطف دعوت کے لئے میں بھی عارضی ممبر بن جاؤں، کیونکہ یوں بظاہر ان سے امید نہیں کہ "مسافر نوازی" سے کام لیں، اکاڈیمی میں اس وقت تک بعض اچھے اچھے مضامین پڑھے جا چکے ہیں اور یہ سب نتیجہ ہے مرزا صاحب ہی کے شغف علمی کا۔ مرزا صاحب سرخ و سپید رنگ، باریک کترے ہوئے نقشہ کے انسان ہیں اور اس حد تک "صنادید عجم" کے آثار آپ میں نمایاں ہیں کہ بے اختیار جی چاہا کہ ایام خزاں میں ان کے "افسانۂ بہار" سنوں، لیکن ہم لوگوں میں جرأت اخلاق کا اس قدر فقدان ہے کہ کہ ایام شباب کی معصیت کو شیوں کا بھی ذکر کرتے ہوئے شرماتے ہیں، حالانکہ جوانی نام ہے اسی "بے راہ روی" کا جو ہر قدم پر نشان لغزش چھوڑ جائے اور اُس "شب روی" کا جو ہر رات کو ایک کہانی بنا جائے

پریم چند گورے رنگ کے شریف ہندو ہیں اور ایسی نورانی شکل رکھتے ہیں کہ اگر ان کی مونچھیں خالص ہندو قسم کی نہ ہوتیں تو میں انہیں مشورہ دیتا کہ وہ دارنتی بن جائیں اور دین و دنیا دونوں سے "مرفوع القلم" زندگی بسر کریں، ہندی شعبہ کا انتظام ان کے سپرد ہے اور رسالہ "مادھوری" کی ترقی انہیں کے مساعی کی ممنون ہے۔ پریم چند کی فسانہ نگاری ملک میں کافی شہرت و قبول حاصل کر چکی ہے، لیکن جب سے انہوں نے ہندی زبان میں لکھنا شروع کیا ہے، ان کی ذہنیت میں کافی تغیر ہو گیا ہے چنانچہ "چوگان ہستی" (ہندی ناول کا ترجمہ) دیکھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ جس قطویل بے جا کو اردو برداشت نہ کر سکتی تھی وہ ہندی میں کس آسانی سے مقبول ہو گئی اور وہ عصبیت جو انکی اردو فسانہ نگاری میں کبھی ایک افسردہ چنگاری سے زیادہ نمودار نہیں ہوتی تھی وہ ہندی میں کس طرح "شعلۂ ملتہب" بن گئی ہر چند پریم چند فارسی عربی سے بقدر ضرورت بھی آگاہ نہیں ہیں اس لئے اردو زبان پر ان کو وہ قدرت حاصل نہیں ہو سکتی جو سادہ فسانہ نگاری کو چھوڑ کر، کسی عمیق غور و فکر یا علمی و تحقیقی تحریر کے لئے درکار ہوتی ہے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کا سادہ اسلوب ادا کافی دلکش ہے جس میں پلاٹ کا مقامی رنگ اور زیادہ دلچسپی پیدا کر دیتا ہے، تاہم مجھے حیرت اس امر پر ہے کہ وہ شخص جو اردو اس قدر صاف لکھنے کا عادی ہو ہندی میں پہونچکر اس قدر ثقیل ہو جاتا ہے کہ اور نہ صرف یہ بلکہ نصاب کی جو اُردو کتابیں نولکشور پریس سے شایع ہوتی ہیں ان میں بھی سنسکرت کا عنصر غالب کر دیتا ہے۔ اردو کو عربی فارسی کی مشکل الفاظ سے پاک کرنے کا یہ مدعا تو نہ ہونا چاہئے کہ سنسکرت کے ثقیل الفاظ ان کے بجائے استعمال کئے جانے لگیں۔ ارادہ ہے کہ نولکشور پریس سے جو اردو کی نصابی کتابیں شایع ہوتی ہیں ان پر آیندہ تفصیل سے بحث کروں اور بتاؤں کہ وہ کس قدر اغلاط سے لبریز ہیں اور فرقہ دارانہ جذبات نے انہیں کس حد تک مسخ کر دیا ہے

یہاں اسوقت تین روزانہ اخبار جاری ہیں، ان میں سب سے قدیم ہمدم ہے جو پہلے جناب جالب دہلوی کی ایڈیٹری میں نکلتا تھا اور اب چودھری رحم علی ہاشمی اس کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ جالب صاحب کا ہمدم سے علیحدہ ہونا شعبۂ انتظام کے اختلاف کی بنا پر ہوا، نہ جالب صاحب کی پالیسی کبھی کوئی نہ تھی اور ہمیشہ اپنے آقا کی مرضی کے مطابق وہ اخبار چلانے کے عادی رہے ہیں۔ ہمدم سے علیحدہ ہونے کے بعد انہوں نے اپنا ذاتی اخبار ہمت کے نام سے نکالا ہے لیکن چونکہ اس کی پالیسی وہی ہے جو نہرو رپورٹ کے مخالفین کی ہے اس لئے پبلک میں ...... زیادہ مقبول ہونے کی توقع نہیں کی جاتی۔ جہاں تک فن صحافت کا تعلق ہے جالب صاحب اپنی وسیع معلومات کی بنا پر اس وقت ایک بے مثل و بے نظیر صحافی ہیں، لیکن چونکہ ان کا طرز تحریر جوش و شوخی سے معرا ہے اس لئے ایک تنگ و محدود حلقہ کے علاوہ ان کا اخبار اور کہیں مقبول نہیں ہو سکتا۔ جالب صاحب کی ایک خصوصیت اور بھی عجیب و غریب ہے کہ باوجود عدم ادعائے شاعری کے وہ صرف اپنے تخلص ہی سے مشہور ہیں اور اس حد تک کہ اگر دفعتًہ ان سے سوال کیا جائے تو شاید بغیر سوچے ہوئے وہ خود بھی اپنا نام نہیں بتا سکتے۔

ہمدم کے دوسرے اڈیٹر چودھری رحم علی ہاشمی ایک جوان العمر انسان ہیں، لیکن جوانی کی حرارت سے بالکل خالی۔ ان کی سنجیدگی، نیکی، دھیما پن اُس کھولت کا پتہ دیتا ہے جو لکھنؤ میں بچوں کی شرارت دور کرنے کے بعد افیون کے استعمال سے پیدا کی جاتی ہے۔ ہاشمی صاحب کے زمانہ میں ہمدم نے ترقی کی ہے جس کا سب سے بڑا سبب پالیسی کا تغیر ہے۔ ترتیب، حجم، دلچسپی اور طباعت کے لحاظ سے بھی قدیم روش میں کچھ تغیر ہوا ہے لیکن ایسا نہیں کر دیکھتے ہی کوئی شخص

"گھبرا کے یہ کہدے کہ لو وہ آئے"

ذوق جدید و رواج حال کے مطابق دو کالم اس میں مزاح کے بھی ہوتے ہیں جو "دو باتوں" کے عنوان سے پہلے صفحہ میں درج ہوتے ہیں۔ "دو دو باتیں" لکھنے والے اک نوجوان شاعر ہیں، جو اس کے شعبۂ ادارت سے وابستہ ہیں۔ یہ شعر بھی اچھا کہتے ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں، آنکھیں بھی سرمگیں ہیں اور جسم بھی چھریرا۔ ۲۰ و ۲۶ تقطیع کا رکھتے ہیں، صورت سنجیدہ ہے لیکن طبیعت شوخ، دہانہ کی ساخت سے ظاہر ہے کہ کسی راز کے چھپانے کے اہل نہیں اور اس لئے دل کا معاملہ ان کے ساتھ کرنا خطرہ سے خالی نہیں، معلوم نہیں ان سے محبت کرنے والے کیونکر زندہ ہیں۔

تیسرا روزانہ اخبار حقیقت ہے، اس کے اڈیٹر اس قسم کے لوگوں میں ہیں جو غلطی سے ایک صدی قبل پیدا نہ ہو سکے تھے اور اب قدرت اپنی فروگذاشت کی تلافی اس طرح کر رہی ہے کہ ان کو زمانہ حال میں پیدا کر کے اڈیٹر بنا دیا۔ سعی و انہماک، صدق و خلوص کے ساتھ کسب معاش کرنا اور کسی کی محکومی اختیار نہ کرنا، یہ ہے نصب العین اس اخبار کا۔

ماہانہ رسائل میں صرف الناظر کے اڈیٹر جناب ظفر الملک سے ملنے کا اتفاق ہوا، یہ بیک وقت لیڈر بھی ہیں اور اڈیٹر بھی، مولانا بھی ہیں اور شہر کے قاضی بھی لیکن دبلا پن بالکل فطری ودیعت ہے، کسی اندیشہ و غم سے اس کا تعلق نہیں۔ بظاہر بہت متواضع و منکسر معلوم ہوتے ہیں "پس پشت" اور "باطن" کا حال خدا جانے۔ نگاہ نقد و نظر اس قدر بلند ہے کہ دنیا میں مشکل ہی سے کوئی چیز انہیں پسند آتی ہے۔ لیکن خود اپنی ذات کو اصول تبصرہ سے مستثنیٰ جانتے ہیں۔ سچ بھی انہیں کے اہتمام سے نکلتا ہے اور عبد الماجد صاحب دریا آبادی اس کے اڈیٹر ہیں۔ ان سے ملنے کا موقع نہیں ملا، مگر سنا ہے کہ ان کا دماغ کسی خاص کیفیت سے متاثر ہے اور ملنا بے سود۔ یہیں سے جناب مولوی صبغۃ اللہ صاحب اڈیٹر خادم الحرمین سے

ملاقات ہوئی۔ آپ خیر سے شاعر بھی ہیں اور شہید تخلص فرماتے ہیں۔ خصایل کے لحاظ سے صبغۃ اللہ کے متعلق کوئی کیا کہہ سکتا ہے، جبکہ ومن احسن من اللہ صبغۃ کی نص قطعی موجود ہے، اللہ ان کو ہندوستان میں بیٹھکر حرمین کی خدمت کی ہمت عطا کرے اور مسلمانوں کو غور کرنے کی توفیق لطف فرمائے۔

لکھنؤ کے شعرار حال میں سے صرف چند کا نام خصوصیت کے ساتھ مشہور ہے:۔ عزیز، صفی، محشر، ثاقب۔ جناب عزیز سے ملنے میں بہت دقت ہوئی کیونکہ آجکل محمود آباد میں قیام رہتا ہے۔ اتفاق سے چند گھنٹے کے لئے لکھنؤ آئے تھے کہ مجھے خبر مل گئی اور میں مکان پر جاکر قدمبوس ہوا۔ میں نے انہیں بھی ایک نحیف الجثہ انسان سمجھ رکھا تھا لیکن یہ بھی "ماشاءاللہ" نکلے۔ چہرہ کے گوشت نے خدوخال چشم و بینی کا بدنمائی کی حد تک احاطہ کر رکھا ہے اور نقشہ کی ذہانت معدوم ہوگئی ہے۔ چہرہ کی خشونت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اندرونی خلش ہر وقت ایذا دیتی رہتی ہے اور وہ اپنی زندگی سے کچھ خوش نہیں ہیں۔ گفتگو میں نہ کوئی دلکشی ہے نہ کوئی عمق و ذہانت، لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کا دماغ شاعرانہ ہے، شعر اچھا کہتے ہیں اور تمام اصناف سخن پر پوری قدرت رکھتے ہیں، مضمون کی جستجو، الفاظ کی تلاش، تراکیب کی چستی، خیال کی حلاوت اور جذبات کی اثرانگیزی ان کے کلام کی خصوصیات ہیں، شاگردوں کی بڑی جماعت رکھتے ہیں۔ جن میں سے رواں اور اثر کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے جو خود اپنی اپنی جگہ استادانہ حیثیت رکھتے ہیں۔

صفی، مہتم شخص ہیں اور غیر "شاعرانہ" حد تک زار و نحیف۔ عجیب بات ہے کہ میں نے ان کی شاعری سے اُن کے "عظیم الجثہ" ہونے پر حکم لگایا تھا، لیکن "یہ" بالکل "وہ" نکلے۔ نہ طبیعت میں شگفتگی، نہ چہرہ پر رونق، نہ اداؤں میں دلبستگی، نہ گفتگو میں جاذبیت، الغرض دنیاوی انسان ہونے کے لحاظ سے وہ صفر کا درجہ رکھتے ہیں، اور ایک ایسی غیر جمالیاتی فضا ان کے چاروں طرف محسوس ہوتی ہے کہ اگر قدرت نے شعر گوئی کا ملکہ نہ دیدیا ہوتا تو شاید ہی کوئی شخص .... مگر سنا ہے کہ آدمی نیک ہیں اور اخلاق و اطوار بھی غیر پسندیدہ نہیں رکھتے۔

شاعر ہونے کی حیثیت سے ان کو مرتبۂ استادی حاصل ہے اور لکھنؤ کے جدید دور کے شعرا میں وہ خاصی قدر و منزلت رکھتے ہیں۔ جہاں تک غزل کا تعلق ہے، ان کے کلام کی سادگی و شگفتگی، یقیناً قابل ستایش ہے، لیکن انہوں نے قومی شاعر بننے کی کوشش میں اس خصوصیت کو ایک حد تک مجروح کر دیا ہے اور ممکن ہے کہ ان کے قومیات شعری کسی طبقہ میں کچھ چیز سمجھے جاتے ہوں، لیکن میں ان کو اس جوش سے بالکل معرّا پاتا ہوں جو قومی نظموں کو غزلوں سے متمایز کر دیتا ہے۔ ان کی بڑی معرکۃ الآرا قومی نظم "وقت آنے دو وقت آنے" والی ہے، لیکن اسمیں ایک مصرعہ بھی ایسا نہیں جس کے اندر شعلہ تو کیا کوئی چنگاری ہی راکھ میں دبی ہوئی مل جائے۔ مثنوی کہنے کا بیشک انہیں خاص سلیقہ حاصل ہے اور اسی میں ترقی کرنا انکی کامیابی ہے اگر وہ سمجھیں۔

اب محشر کا وہ ہنگامہ نہیں ہے جو پہلے کسی وقت تھا، لیکن خیر بعض بعض شعر اب بھی کہہ جاتے ہیں اور سنا ہے کہ آدمی بُرے نہیں۔ مجھ سے صرف یکبار چوک میں سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ یہاں کے کوئی عطر فروش ہوں گے، لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ جناب محشر آپ ہی ہیں، خود ان کی زبان سے ان کے کلام سننے کا فخر مجھے حاصل نہیں ہوا، اور نہ اس کے لئے میں زیادہ بیتاب تھا۔

جناب ثاقب آج کل مہاراجہ صاحب محمود آباد کے بعض صاحبزادگان کے اتالیق ہیں۔ اور اپنی خدمات کی انہماک کیوجہ سے شعر و شاعری

کی جانب زیادہ توجہ نہیں کر سکتے، آدمی بہت نیک، خوش اخلاق، متواضع و منکسر مزاج معلوم ہوتے ہیں، اور چہرہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عام شعراکی طرح ان کا باطن ناقابل ذکر نہیں ہے۔ ان کے شعروں کی خصوصیت یہی ہے کہ ابتذال کہیں نہیں ہوتا اور خیال بھی عام سطح سے بلند ہوکر اچھوتی چیز پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

عروج جو یہاں دولھا صاحب کے نام سے مشہور ہیں، خاندان انیس کے باقیات الصالحات میں سے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ شعر خوب کہتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں۔ ہر چند ضعیفی سے کمر جھک گئی ہے اور تمام وہ علامات شیب جو انسان کو آدمی سے خدا جانے کیا بنا دیتے ہیں انمیں پوری طرح نمایاں ہیں، لیکن جب وہ ممبر پر پہونچتے ہیں تو دفعۃً ایسا تغیر ان میں پیدا ہوتا ہے جیسے کوئی اچانک نشہ سے چونک پڑے اور عظمت کے تمام حرکات پوری قوت کیساتھ رونما ہونے لگتے ہیں۔

جناب احسن لکھنوی جو اپنی ڈرامہ نگاری کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتے ہیں، غزلگوئی کے لحاظ سے کوئی مرتبہ رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں لیکن بہ حیثیت انسان ہونے کے وہ ضرور خاص چیز ہیں۔ طبیعت بہت غیور پائی ہے اور سب سے الگ بے لاگ زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں، باوجود عمر رسیدہ ہونے کے اب بھی ان کی جوانی کا بانکپن ان کے اعضاء سے ظاہر ہے اور مخصوص حلقۂ احباب میں اب بھی ان کی شگفتگی و زندہ دلی دیکھنے کی چیز ہوتی ہے، موسیقی سے خاص لگاؤ ہے اور ہارمونیم اچھا بجاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی جس لطف سے بسر کی ہے، وہ شاید یہاں کے کسی شاعر کو نصیب ہوئی ہو، اور اب بھی جس نفاست و پاکیزگی اور جس سلیقہ کے ساتھ وہ رہتے ہیں اس کا نشان بھی دوسرے شاعروں میں نہیں پایا جاتا۔

یہاں کے شیعی طبقہ کے صحافیوں میں صرف ایک سید ممتاز حسین صاحب عثمانی اڈیٹر اودھ پنچ قابل ذکر ہیں، ہر چند موجودہ اودھ پنچ کا موازنہ سجاد حسین کے اودھ پنچ سے کرنا مناسب سی بات ہے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ لکھنؤ میں سوائے ممتاز حسین صاحب کے اودھ پنچ کی روایات قدیمہ کی یاد کو تازہ رکھنے والا کوئی اور ہو بھی نہیں سکتا۔ آدمی پڑھے لکھے ہیں، وسیع المطالعہ ہیں، اور ہر چند انکی وضع و صورت اور گفتگو سے کبھی کسی کو یہ توقع نہیں ہوسکتی کہ وہ پنچانہ رنگ کے انسان ہوں گے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ ایسے ہی ہیں اور بعض اوقات ان کا قلم ایسے نقوش چھوڑ جاتا ہے کہ بے اختیار داد دینا پڑتی ہے۔ میں اس سلسلہ میں ان واقعات کو بیان کرنا پسند نہیں کرتا جو انکی عصبیت کے ثبوت میں مجھ سے بیان کئے گئے، کیونکہ اگر وہ صحیح ہوں تو بھی جہاں تک پنچ اور پنچپن (کوئی صاحب اسے کچھ اور نہ پڑھ لیں) کا تعلق ہے ان کی تعریف ہی کی جائے گی۔

میں ان سے ملنے کے بعد جائے قیام پر واپس آیا ہی تھا کہ میرے ایک دوست کا تار آیا جسمیں انہوں نے مجھے ایک ضروری مسئلہ طے کرنے کیلئے دیرہ دون طلب کیا تھا، اس لئے میں بغیر تکمیل پروگرام کے لکھنؤ چھوڑ رہا ہوں۔ اگر زندگی رہی تو پھر کسی وقت حاضر ہونگا، لیکن محرم کا زمانہ بچاکے تاہم دیرہ دون پہونچکر مجھے یہاں کے اس مشاعرہ کا حال ضرور لکھنا ہی ہے جس میں شرکت کا فخر مجھے حاصل ہوا تھا اور اسی سلسلہ میں لکھنوی شاعری کی موجودہ ذہنیت پر اپنے خیالات کا اظہار کرونگا، خواہ اس کے بعد مجھے "نادعلیاً" کا حصار ہی کیوں نہ اپنے گرد کھینچنا پڑے

ازدواج مکرر

(بہ سلسلۂ سابق)

(۵)

ہر وہ شخص جو ذکی کی جگہ اپنے آپ کو فرض کرے، بہ آسانی اندازہ کر سکتا ہے کہ صفیہ کی اس انتہائی صفائی اخلاق سے اس کو کس قدر صدمہ پہونچا ہوگا اور صفیہ کے اعلان کے بعد دنیا نے ذکی کو کیا سمجھا ہوگا۔ ذکی کو صدمہ اس امر کا نہ تھا کہ اس کی بیوی کی وہ ہستی جو اس نے انتہائی سعی اور انہماک کے بعد خود اپنے ادیب دماغ سے پیدا کی تھی، صفیہ کی تحریر سے فنا ہو گئی، بلکہ اس کو برہمی اس امر کی تھی کہ دنیا نے اس جذبہ کو بالکل عریاں دیکھ لیا۔ انسان غلطی کرنے کے بعد دنیا کو فریب میں مبتلا رکھنا پسند کرتا ہے، لیکن یہ کبھی گوارا نہیں کرتا کہ دنیا پر اس کی غلطی ظاہر ہو جائے۔ اگر ذکی غور کرتا تو اس کو صفیہ کا ممنون ہونا چاہیے تھا کہ اس کی کارگاہ فریب جس کا نتیجہ یقیناً اچھا نہ ہوتا جلد درہم برہم ہو گئی لیکن اس نے صفیہ کی اس پاکبازی اور علوئے اخلاق کو حد درجہ غیر وفا شعاری بلکہ غداری سے تعبیر کیا اور انتہائی غم و غصہ کے عالم میں اس سے علیحدہ ہو گیا۔

وہ جس وقت کلکتہ پہونچا تو اس کا مقصود صرف یہ تھا کہ چند دن رہنے کے بعد یہاں سے کسی اور جگہ چلا جائے گا، لیکن بدبختی کہیے یا خوش بختی کہ اس نے قیام کیا وہاں کے ایک ایرانی خاندان میں اور ان لوگوں کی خاطر مدارات نے ایسا کچھ سکون پیدا کر دیا کہ وہ اپنے اضطراب میں کچھ کمی محسوس کرنے لگا اور جس وقت شمسہ (جو حقیقتاً اس خاندان کی مہر نیم روز تھی) انتہائی بے تکلفی کے ساتھ صبح کو اپنی نرم و شیریں آواز میں "آفندم، آفندم ذکی" یا "آقایم" یا "آغا ذکی" کہکر اس کے کمرہ کے دروازہ پر دستک دیتی تو اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے برفباری کے زمانہ میں کوئی گرم شعاع سینہ سے گذر کر دل تک پہونچ رہی ہے اور وہ زندگی کی کسی نئی لذت سے آشنا ہو رہا ہے۔

شمسہ اپنی تعلیم کے لحاظ معمولی چیز تھی، لیکن چونکہ ہندوستان کے ہر شخص کو فارسی بولنے والی عورت خواہ وہ کتنی ہی جاہل کیوں نہ ہو زردشت کی بیٹی ہی معلوم ہوتی ہے، اس لئے جب کبھی ایرانی تہذیب کے مطابق وہ "جانم فدایت یا قربانت شوم" کے فقرے استعمال کرتی تو ذکی ہمہ تن عالم شعر و موسیقی میں غرق ہو جاتا اور ایسا محسوس کرتا کہ وہ اس سے بہت کمتر درجہ کا انسان ہے۔ اس دوران میں بارہا ذکی نے روانگی کا خیال ظاہر کیا، لیکن جس وقت وہ اس کے جواب میں شمسہ کے میگوں لبوں سے "اقامت مستدام، سرکار این چہ می فرمائید" سن لیتا تو اس کے اعصاب میں استرخائی کیفیت پیدا ہو جاتی اور وہ پھر اسے "فدویانہ" نگاہوں سے دیکھ کر اس طرح خاموش ہو جاتا، گویا قوت گویائی اس سے چھین لی گئی ہے۔

ذکی فارسی اچھی جانتا تھا، بے تکلفی سے بول سکتا تھا اور ذوق شعری کے لحاظ سے وہ یقیناً بہت بلند چیز تھا، لیکن شمسہ کو دیکھتے ہی اس کی طلاقت لسانی اور اس کی ادبیت سب کافور ہو جاتی تھی اور وہ حقیقی معنے میں بالکل عجمی (گونگا) بنکر رہ جاتا تھا۔ ہر چند کسی قسم کا لگاؤ اُسے شمسہ سے نہیں پیدا ہوا تھا، لیکن اس کی معیت میں وہ اپنے آپ کو بالکل نئی دنیا میں پاتا تھا اور تھوڑی دیر کے لئے اپنی گذشتہ معصوم زندگی

یادکرکے کشیدہ خاطر ہوجاتا۔ شمسہ کا اصلی وطن تو طہران تھا لیکن اس کا باپ بہ سلسلہ تجارت کلکتہ آیا تھا اور پھر اس کو ایران واپس جانے کا موقع نہیں ملا۔ اس نے یہیں ایک ایرانی خاندان میں شادی کی جس سے شمسہ پیدا ہوئی۔ تجارت میں جب وہ کامیاب نہ ہوا تو اس نے ریلوے کے دفتر میں ملازمت کرلی، اور اپنے مکان کا ایک حصہ لوگوں کے قیام کے لئے مخصوص کردیا۔ وہ قیام و طعام وغیرہ کے جملہ مصارف دس روپیہ روز کے حساب سے لیتا تھا اور چونکہ شمسہ کی ماں ضعیف ہوگئی تھی اس لئے گھر کا سارا انتظام مہمانوں کی نگہداشت، خاطر مدارات، سب شمسہ ہی کے سپرد تھی جسے وہ ایک یہودی خادمہ کی مدد سے پوری ذہانت کے ساتھ انجام دیتی تھی۔ یہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ شمسہ تعلیم کے لحاظ غیر معمولی چیز نہ تھی لیکن اپنی ذہانت کے اعتبار سے یقیناً وہ بڑا درجہ رکھتی تھی۔ فارسی تو خیر اس کی مادری زبان ہی تھی۔ لیکن اردو میں بھی اسے ایک ادیبانہ ذوق حاصل تھا اور فارسی کی طرح اردو کے بھی اسے اچھے اچھے شعر یاد تھے، جنہیں وہ برجستگی کے ساتھ استعمال کرتی تھی اور یہی ایک چیز ایسی تھی جس نے اس کی تہذیب و شائستگی، اس کی خوش ادائی، اس کی شیریں گفتگو اور سب سے زیادہ "بادۂ سرجوش" کی طرح اس کے بھرپور شباب کے ساتھ ملکر ذکی کے لئے کافی اسباب تباہی پیدا کردئے تھے اور اگر اپنی فطرت کے لحاظ سے وہ اس قدر محتاط و سنجیدہ نہ ہوتا اور کبھی کبھی صفیہ کا خیال اس کے کرب و ملال میں اضافہ نہ کردیا کرتا تو غالباً وہ شمسہ کی دعوت شیفتگی کو اس سے بہت پہلے قبول کرلیتا۔ لیکن اس کی چوٹ سخت تھی اور تازہ اس لئے ابھی تک اس کی متشائم کیفیت دور نہیں ہوئی تھی اور اگر کہیں وہ شیفتگی کی طرف مایل ہوتا بھی تو دفعۃً اس کو ماضی کا خیال آجاتا اور مضمحل ہوکر رہجاتا۔

اول اول جب ذکی نے یہاں آکر قیام کیا تو شمسہ کی طرف سے سوائے معمولی اور رسمی مدارات کے کوئی خاص توجہ صرف نہیں کی گئی، لیکن جب اس کو معلوم ہوگیا کہ دولت کے لحاظ سے وہ ایک رئیس کی حیثیت رکھتا ہے تو پھر شمسہ کی تمام تابناکیوں کا مرکز سوائے ذکی کے اور کوئی نہ رہگیا۔ اس نے اپنی خلوت و جلوت، اپنی صبح و شام اپنی زیبایش و آرایش، ذکی کی تالیف کے لئے وقف کردی اور غلط بیانی ہوگی اگر کہا جائے کہ ذکی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ لیکن پورے استحکام کے ساتھ اپنے مرکز سے ہٹتا جارہا تھا اور جس وقت رات کو وہ خیرباد یا شب بخیر کہہ کر رخصت ہونا چاہتی تو بے اختیار اس کا جی چاہتا کہ ہات پکڑکر اسکو بٹھالے، اور کچھ دیر اور اس کی باتیں سنتا رہے۔ لیکن اس کی ہمت جواب دے جاتی اور وہ مسکراتی ہوئی، اپنے لچیلے بدن میں ناگن کے سے بل ڈالتی ہوئی، آخری مرتبہ دروازہ کھول کر انتہائی شوخی کے ساتھ اُسے جھانکتی اور غائب ہوجاتی۔

یہ تمام باتیں ایسی تھیں کہ اگر ذکی کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو کبھی کا دفتر تدبیر و مصلحت کو "غرقِ مے ناب" کرچکا ہوتا، لیکن گذشتہ ایک ربع صدی کی راسخ صلاحیت جو ذکی کو وراثت و تربیت کے ذریعہ سے حاصل ہوئی تھی یوں دفعۃً نہیں ٹوٹ جاسکتی تھی۔ رات رات بھر اسکو یہی سوچتے گزرجاتی تھی کہ آخر یہ بے معنی زندگی کب تک بسر ہوسکے گی، اور اس رہبانیت کا نتیجہ کیا ہے، لیکن آخر میں کامیابی اس کے اخلاق ہی کو ہوتی تھی، یہانتک کہ جب شمسہ صبح کو اس کے لئے چاء کا سامان لاتی تو کبھی کبھی اس کے تیور بالکل اجنبی سے محسوس کرنے لگتی لیکن اس نے بھی ایک عزم کرلیا تھا اور وہ پھر اس کو اسی نقطہ پر کھینچکر لے آتی جہاں روزانہ اسے چھوڑکر جاتی تھی

ایک دن، موسم بہت خوشگوار تھا، سامنے دریچہ سے نارنج کی خوشبو کمرہ کو معطر کئے ہوئے تھی اور شاما کا جوڑ صحن باغ کے گلاب پر آ آکر اپنی مست و شیریں آواز سے ذکی کے دلمیں ہر مرتبہ ایک نیا ولولہ پیدا کرجاتا تھا۔ وہ دیر سے فلسفۂ حیات پر غور کررہا تھا اور اس نتیجہ پر پہونچ رہا تھا کہ کہیں

حیات و ثنات، ایک ہی چیز کے دو نام تو نہیں ہیں، مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ "در توبہ ابھی بند نہیں ہوا" اگر ایک طرف دعوت و تبلیغ کا نہایت غایر فلسفہ اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے، تو دوسری طرف اس میں نوید معصیت بھی شامل ہے اور ایک انسان اپنے ذوق و میلان کے لحاظ سے حسب ضرورت جس پہلو کو چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ اس وقت ذکی کی رفتار خیال دوسرے پہلو کی طرف مایل تھی اور صرف "تجربہ و جستجو" کے بہانہ سے وہ ایک بار اپنے آپ کو ماحول کے سپرد کر دینا چاہتا تھا۔ اتفاق سے اسی وقت شمسہ آگئی، اور ایسے غیر معمولی بانکپن کے ساتھ کہ غریب ذکی کی وہی حالت ہوگئی جیسے کوئی شخص ساحل سے پھسل رہا ہو اور پشت سے کوئی دھکا دیدے۔ آج شمسہ کی اٹھارویں سالگرہ تھی اور اہتمام کے لحاظ سے بھی واقعی اٹھارویں تھی، سر سے لیکر پانوں تک رنگ و ریشم، عطر و خوشبو میں بسی ہوئی تھی، معلوم ہوتا تھا وہ کوئی تتری ہے جو رات بھر پھولوں میں بسا کر صبح کو چھوڑ دی گئی ہے۔ وہ مذہبا گیر تھی اور آتش پرست لیکن آج تو وہ اپنے مذہب کی خدا یکسر شعلۂ جوالہ بنی ہوئی تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی اٹھلاتی ہوئی اندر آئی اور بے اختیار ذکی کے منھ سے نکل گیا:۔

چہ آتش ست کہ بر جان ما نہادی باز

اس نے بڑھ کر ذکی کے دامن کو بوسہ دیا اور بولی:۔

"مگر نشنیدہ ــــ

اگر بہ سوزدت اے دل ز درد نالہ مکن

دم از محبت او میزن و بدرد بساز"

ساحل چھوٹ گیا تھا، ذکی کے قدم اکھڑ چکے تھے، سیلاب نے اسے گھیر لیا تھا، اور وہ ایک ایسے عالم میں جسے مدہوشی سے زیادہ بیہوشی کہنا زیادہ موزوں ہے شمسہ کے قدموں کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ اس نے شمسہ کا دامن تھام لیا اور انتہائی شیفتگی و ربودگی کے عالم میں کہہ اٹھا:۔

"بہر کمند کہ خواہی بگیر و بازم بند"

شمسہ نے شوخی سے فوراً دوسرا مصرعہ پڑھ دیا کہ:۔

"بشرط آنکہ ز کارم نظر نہ گیری باز"

اس سوال جواب سے ذکی اس وقت اپنے آپ کو جہانگیر اور شمسہ کو نورجہاں سمجھ رہا تھا، اور شام ہونے سے قبل حقیقی معنی میں وہ جہانگیر ہو گیا تھا اور شمسہ نورجہاں

(۶)

گذشتہ واقعہ کو ایک ماہ سے زیادہ زمانہ گذر گیا ہے اور ذکی نے ایک علیحدہ کوٹھی شمسہ کے قیام کے لئے لے لی ہے۔ باپ کی جمع کی ہوئی دولت بیدردی کے ساتھ صرف ہو رہی ہے اور سوسائٹی میں شمسہ خانم کا وجود جذبۂ مرکزی پیدا کرتا جا رہا ہے، رولس کار سواری کے لئے، زر کار پردوں اور قیمتی فرنیچر سے آراستہ مکان رہنے کے لئے، متعدد خادموں کی جماعت خدمت کے لئے۔ اسکاٹ لینڈ کی بہترین شراب لطف زندگی کیلئے اور بنک کی چیک بُک ہر اس آرزو کی تکمیل کے لئے جس کا خیال بھی کبھی شمسہ کے دل میں نہ آسکتا تھا، اس کے پاس موجود تھی اور ذکی جس کو اپنی زندگی

ہیں اول مرتبہ یہ معلوم ہوا تھا کہ دولت اپنے اندر کیسے کیسے اسباب لذت و تفریح پنہاں رکھتی ہے، پانی کی طرح شمسہ کے قدموں پر بہا رہا تھا، اور سمجھتا تھا کہ شاید ابھی تک وہ اس نیم نگاہ کی بھی قیمت نہیں ادا کر سکا جو شمسہ اس پر کبھی کبھی صرف کر دیتی ہے۔ وہ خود بھی تمام اصول اخلاق و احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر آزادی کے ساتھ ہر اس عشرت میں شریک تھا جس کی طرف کبھی اسکا ذہن بھی منتقل نہ ہوا تھا۔ اور جس وقت وہ نشۂ شراب میں شمسہ کے التفات پر نگاہ کرتا تو اس کے اندر جذبۂ ایثار اور زیادہ قوی ہو جاتا اور بے اختیار ہو کر پوچھ بیٹھتا کہ "میں کیونکر تمہارے اس احسان سے عہدہ برآ ہو سکتا ہوں"۔ شمسہ نہایت ہوشیاری سے اس کے ان جذبات کا مطالعہ کر رہی تھی اور آخر کار ایک دن جب کہ وہ پوری طرح اثرِ حسن و شراب سے متاثر ہو رہا تھا اس نے پوری لگاوٹ کے ساتھ اپنا وہ آخری حربہ استعمال کیا جس سے آسمان و زمین میں کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ عورت جب تک عالم عشق و محبت میں ہے، خواہ وہ ہنسے یا روئے، یکساں طور پر دل ڈبو دینے والی ہے، لیکن اگر وہ صرف محبت کی تمثیل کر رہی ہے تو غنیمت سمجھو جب تک وہ ہنستے کھیلتے تمہاری زندگی کو پر لطف بنا رہی ہے، ورنہ عورت کا وہ آنسو جو مکر و فریب کا نتیجہ ہوتے ہیں، ایک زبردست سیلاب اپنے اندر پنہاں رکھتے ہیں کہ مشکل ہی سے کوئی شخص ثابت قدم رہ سکتا ہے۔ اس وقت تک ذکی کی زندگی شمسہ کے ساتھ یکسر باغ و بہار کی طرح بسر ہوئی تھی اور وہ بالکل بھول گیا تھا کہ دنیا میں رنج و ملال کس کو کہتے ہیں، طرب و نشاط کا وہ دلفریب منظر جو تھوڑی دیر کے لئے انسان کو خدا بنا دیتا ہے، ذکی کے دل و دماغ پر اس طرح چھا گیا تھا کہ اس کا ردِ عمل حد درجہ خطرناک ثابت ہوتا۔

رات کا وقت تھا، دریچوں سے ہلکی ہلکی خنک و معطر ہوا وہسکی کی ایک پوری بوتل سے چکر کھانے والے دماغ کو اور آسمان پر اڑائے لئے جا رہی تھی، ذکی پر ایسی مستی و سرخوشی کا عالم طاری تھا کہ اس سے قبل کبھی نہ ہوا تھا اور شمسہ زیبائش و آرائش کے اس بانکپن کے ساتھ جو کبھی اس میں پیدا نہ ہوا تھا، اپنی تمام نسائی لطافتیں و عنایتیں اس پر صرف کر رہی تھی کامیاب محبت کی باتیں مزے مزے سے ہو رہی تھیں کہ دفعۃً شمسہ ذکی کی آغوش سے علٰحدہ ہو کر کچھ سوچنے لگی اور پھر شوفا کے ایک جانب گردن ڈالکر رونے لگی۔ ذکی جس کی جدید حیات نشاط میں یہ بالکل پہلا تلخ منظر تھا، گھبرا گیا، پہلے تو چند منٹ تک شمسہ نے کوئی جواب ہی نہیں دیا لیکن جب ادھر سے اصرار و اضطراب کی حد ہو گئی تو آنسو پونچھتے ہوئے یا یوں کہئے کہ رومال میں "عطر فتنہ" جذب کرتے ہوئے اٹھی اور بولی:۔ "حیران ہوں کہ آپ کی ان غیر معمولی عنایتوں کو شکریہ کیوں کر ادا ہو سکتا ہے۔ آپ نے جو عزت مجھے دی۔ وہ میرے خواب و خیال سے زیادہ ہے، اور میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ مجھے اب آپ کو زیادہ تکلیف دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، جب تک میں اپنے آپ کو بھی خدمتگذاری کی اہل نہ ثابت کر دوں"۔

ذکی خواہ کتنا ہی آلودۂ عصیاں ہو لیکن چونکہ اس کی فطرت صالح تھی اس لئے شمسہ کے اخلاق کا اس نے یہ زبردست ثبوت دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوا، اور بولا:۔

"شمسہ یہ کیا کہہ رہی ہو۔ اگر تمہیں خدمت کرنے پر آ جاؤ گی تو پھر دنیا میں مخدوم بنکر کون رہیگا، اور پھر یوں بھی جو تمہارے فرائض ہیں ان کو اس قدر تکمیل کے ساتھ انجام دے رہی ہو کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں"۔

شمسہ:۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ چند دن میں بہت بیکار روپیہ میرے اوپر ضایع ہوا اور میں چاہتی ہوں کہ اس کی تلافی کی جائے۔ پہلی صورت تو

بہتر ہے کہ غیر ضروری مصارف کم کر دئیے جائیں اور جو اس وقت تک صرف ہو چکا ہے اسکو کسی نئے طریقہ سے حاصل کیا جائے۔"

ذکی:۔ "اس کی کیا صورت ہے"

شمسہ:۔ "آپ کو معلوم ہے کہ تجارت میرا خاندانی (آبائی) پیشہ ہے اور اسی میں ترقی کرنا میرا نصب العین رہا ہے، مجھے اس میں کافی تجربہ حاصل ہے اور کلکتہ کے بازار کا جس قدر غایر مطالعہ میں نے کیا ہے کوئی نہیں کر سکتا۔ کل ہی جو خبر مجھے معلوم ہوئی ہے' وہ اسقدر کامیابی کی ہے کہ اگر دو لاکھ روپے میرے پاس ہوتے تو چند دن میں آپ کو یہاں کا "ملک التجار" بنا دیتی ۔۔۔ اور ۔۔۔"

ذکی:۔ "دو لاکھ روپیہ نقد تو موجود نہیں ہے، لیکن اس کی فراہمی زیادہ دشوار بھی نہیں۔ اگر تم ایک ہفتہ کی مہلت دو، تو میں جائداد مکفول کر کے لا سکتا ہوں۔"

شمسہ:۔ یہ سنکر کچھ خاموش ہوئی اور بولی کہ "نہیں یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا، اچھا اس خیال کو جانے دیجئے۔ میری ہزاروں آرزوئیں پوری ہو چکی ہیں، ایک پوری نہ ہوئی تو کیا۔"

یہ کہکر اس نے افسردگی کے ساتھ ٹھنڈی سانس لی اور ایک طرف گردن ڈالکر خاموش ہو گئی۔

ذکی جس نے اس وقت تک شمسہ کو ملول و حزین دیکھنے کی تکلیف برداشت نہیں کی تھی، بیتاب ہو گیا اور اس خیال سے نہیں کہ وہ ملک التجار ہو جائے گا، بلکہ صرف اس بنا پر کہ اس طرح شمسہ کی تمنا پوری ہو گی، وہاں سے اٹھا اور جلدی جلدی اسباب سفر درست کر کے اسٹیشن پہونچا، دوسرے دن ایک ہندو مہاجن سے گفتگو کر کے چوتھے دن دو لاکھ کی رقم شمسہ کے نام سے بنک میں جمع کر دی اور بنک کی کتاب مع چک بک کے اس کے آغوش میں جاکر ڈالدی۔

(۷)

اس واقعہ کو پندرہ دن گزر چکے ہیں اور ذکی نے شمسہ کے طرز عمل میں بظاہر اس سے زیادہ کوئی تغیر محسوس نہیں کیا کہ وہ بہ نسبت پہلے کے گھر سے زیادہ غیر حاضر رہنے لگی ہے۔ ایک آدھ بار اس کا ذکر آیا بھی تو اس نے تجارتی تدابیر کا بہانہ کر کے ٹالدیا اور یہ بھی خاموش ہو رہا لیکن اس کے ساتھ یہ امر ضرور ذکی کے لئے باعث تکلیف ہوتا جا رہا تھا کہ اس کے احباب کا حلقہ وسیع ہوتا جا رہا ہے اور بہ نسبت پہلے کے تحائف و ہدایا کی تعداد میں بھی خاصہ اضافہ نظر آتا ہے ذکی فطرتاً رشک کرنے والی طبیعت نہ رکھتا تھا یا یوں کہئے کہ جب تک شمسہ نے اپنی تمام دلداریاں صرف اسی کے لئے مخصوص رکھیں، اس نے پرواہ نہیں کی کہ کون آتا ہے اور کون جاتا ہے لیکن جب اس کی توجہ ہٹی تو اس کو بھی اس کا احساس شروع ہوا، اور نہایت ہی مخفی قسم کے برہمی کے آثار اس کے چہرہ سے ظاہر ہونے لگے۔

پہلے شمسہ کو دونوں وقت ذکی کے ساتھ کھانا کھانا لازم تھا، لیکن اب رات کا کھانا وہ مستقلاً باہر کھانے لگی تھی اور اگر کبھی ذکی نے اس کی شکایت کی تو ہنسکر ٹالدیا، یا اپنے افسوں کا اثر قایم رکھنے کے لئے چلتے چلتے ایک آدھ غمزہ صرف کر دیا۔

کامل ایک ماہ تک ذکی شمسہ کی حالت کا مطالعہ کرتا رہا اور اس کی اجنبیت کو جس میں روز کچھ نہ کچھ اضافہ ہو رہا تھا بغور دیکھتا رہا۔ ایک شام جبکہ وہ باہر جانے کے لئے بہترین ملبوس اور اپنے تمام قیمتی زیور نکال رہی تھی، ذکی آہستہ آہستہ اس کے کمرہ میں گیا اور بولا "شمسہ

مجھے تم سے کچھ کہنا ہے، تھوڑی سی شکایت کرنا ہے، تم کپڑے پہنتی رہو، میں آڑ سے کہتا رہوں گا اور تم جواب دیتی رہنا" شمسہ نے جو کسی زیور کے نہ ملنے سے جھنجھلا رہی تھی، غضب آلود نگاہوں سے ذکی کو دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

ذکی نے پھر اس کو مخاطب کیا لیکن اس استفسار کے ساتھ کہ "آج کہاں کی تیاری ہے"۔

شمسہ "عقد پروین کلب میں جلسہ ہے اور مجھے بہترین تقریر پر انعام دینا ہے۔ معاف کیجئے اس وقت بہت مصروف ہوں۔ کل میں آپ کی تمام شکایتیں دور کر دوں گی"

شمسہ کے لب و لہجہ میں کچھ ایسی برودت تھی کہ ذکی کو سخت صدمہ پہونچا اور اس نے ارادہ کیا کہ آج اس کی تحقیق ضروری ہے کہ یہ عقد پروین کلب جا رہی ہے یا کہیں اور۔ یہ سوچکر وہ واپس آیا اور پہلے سے کپڑے پہن کر باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ موٹر پر سوار ہو کر بنگلہ سے باہر آئی، اور ذکی بھی ایک ٹیکسی پر بیٹھ کر اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ لیکن ذکی کے غم و غصہ و حیرت واستعجاب کی انتہا نہ رہی جب اس نے شمسہ کو بجائے عقد پروین کلب کے گرانڈ ہوٹل میں جاتے دیکھا اور وہاں سے وہ ایک نوجوان شخص کو لیکر جسے وہ بالکل نہیں پہچانتا تھا، ایڈن گارڈن کی طرف چلدی۔

ذکی لاکھ متین و سنجیدہ سہی، لیکن پھر بھی اس کی رگوں میں شریف خون دوڑ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر انگاروں پر لوٹنے لگا اور کامل دو گھنٹے جبتک وہ اپنے محبوب کو لیکر باغ کے کنجوں سے باہر نہیں آئی یہ ہزاروں تجویز بنا بنا کر بگاڑتا رہا، حتےٰ کہ یہ ایک عزم راسخ کر کے اس طرف بڑھا جہاں شمسہ کا موٹر کھڑا ہوا تھا اور ٹھیک اس وقت جبکہ یہ دونوں دروازہ کھولکر اندر بیٹھنے والے تھے یہ بھی پہونچ گیا۔ شمسہ اس کو دیکھ کر سہم گئی اور اس کا محبوب تھر تھر کانپنے لگا۔ ذکی نے جیب سے بجلی کا لمپ نکالکر ان دونوں کے چہرہ پر روشنی ڈالی اور پھر اسے گل کر کے نہایت ادب سے سر جھکا کر شمسہ سے پوچھا کہ کیا عقد پروین کلب میں آپ نے اسی نوجوان کو بہترین تقریر پر انعام دیا ہے جس سے زیادہ قیمتی چیز آپ اور کچھ نہ دیسکتی تھیں۔ افسوس ہے کہ میرے پاس آئینہ نہیں ورنہ میں آپ کو دکھاتا کہ میں آپ کو کیا دیکھ رہا ہوں۔ (نوجوان سے مخاطب ہو کر) کیا آپ خود اپنی تعریف کر سکتے ہیں (شمسہ سے) کچھ آپ ہی فرمائیے۔

شمسہ اپنا اضطراب دور کر چکی تھی اور یہ معلوم کر کے کہ اب پردہ اٹھ گیا، اور تاویل سے تلافی ممکن نہیں، اس نے اپنے بطون کو دفعۃً بے نقاب کر دیا اور بپھر کر بولی کہ "آپ کو میری آزادی میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ آپ آج اس بات کو دیکھ رہے ہیں جسکو اس سے قبل دیکھنا چاہئے تھا میرے راستہ میں حایل ہونے کی ضرورت نہیں اور اس وقت سے میرے اور آپ کے درمیان کوئی تعلق نہیں۔ یہ کہکر اس نے ذکی کو اسی جگہ حیران و مبہوت چھوڑ دیا اور اپنے محبوب کا ہاتھ پکڑ کے موٹر میں بیٹھی اور چلدی۔

(۸)

پندرہ روز سے جو بحرانی تپ کا دورہ ذکی پر پڑا تو کسی طرح کم ہونے میں نہیں آتا۔ اگر کسی وقت کچھ ہوش بھی آجاتا ہے تو اس سے زیادہ نہیں کہ وہ صفیہ کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے، لیکن جب اس کا واہمہ اسے شمسہ کی صورت میں اسے پیش کرتا ہے تو پھر آنکھیں بند کر کے ایک کراہ کیساتھ منھ پھیر لیتا ہے۔

جس وقت ذکی کا تار ملنے پر عزیز (صفیہ کا بھائی) کلکتہ گیا ہے تو اس کی حالت اس قدر خراب نہ تھی اور کسی نہ کسی طرح وہ اس کو اپنے گھر تک

آیا تھا، لیکن یہاں آنے کے بعد دوسرے ہفتہ سے جو شدت مرض کی ہوئی تو بڑھتی ہی رہی۔

عزیز ایک دفتر میں ساٹھ روپیہ ماہوار ملازم تھا اور اپنی بیوہ ماں اور بہن (صفیہ) کی کفالت کا ذمہ دار تھا، اسی خیال سے اس نے شادی بھی نہیں کی تھی کہ وہ اس سے زیادہ بار کا متحمل نہ ہو سکتا تھا، ذکی کی مالی حالت اسقدر سقیم ہو چکی تھی کہ اگر عزیز اسے کلکتہ جاکر نہ لے آتا تو وہ خود کرایہ تک ادا نہ کر سکتا۔

علاج کے مصارف بہت زیادہ تھے مگر عزیز قرض و ام سے اور صفیہ اپنے زیور بیچکر (جو دو چار اس کے پاس تھے) ان کو برداشت کر رہے تھے، فکرمند ہر شخص تھا، لیکن صفیہ کی حالت بہت دردناک تھی، وہ گذشتہ ۶ ماہ کے اندر جب سے ذکی اس کو چھوڑ کر چلا گیا تھا شب و روز ہر وقت اسی کی یاد میں محو رہتی تھی اور ایک خاموش پجاری کی طرح دل ہی دل میں اس کی پرستش کر رہی تھی، ہر چند وہ بالکل بے خبر تھی کہ ذکی کہاں اور کس عالم میں ہے، لیکن اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور آئے گا اور گذشتہ عہد الم کی پوری تلافی ہو جائے گی، مگر وہ اس سے آگاہ نہ تھی کہ اب ذکی ملے گا بھی تو اس حال میں کہ اس کی زندگی خطرہ میں ہوگی، عزت خاک میں مل چکی ہوگی اور دولت و جائداد بالکل تباہ و برباد۔ عزیز کے زبانی اسے تمام وہ حالات معلوم ہو گئے تھے جو اس نے کلکتہ میں سنے تھے، لیکن اب نہ اسے ان رسوائیوں کا خیال تھا، نہ عسرت و افلاس کا بلکہ وہ تڑپ رہی تھی اس کے لئے کہ کسی طرح وہ اس مرض سے جانبر ہو جائے اور اسے پھر اس کی خدمت کا موقع ہاتھ آئے۔

ایک ایک کرکے امید و بیم کے چالیس دن گذر گئے ہیں اور ذکی جو بالکل اپنے جسم کا سایہ سا معلوم ہوتا ہے، بے حس و حرکت لیکن تپ میں مبتلا پڑا ہوا ہے۔ صفیہ پاس بیٹھی ہوئی رو رہی ہے اور عزیز بھی مایوسی کی حالت میں باہر کمرہ میں افسردہ و خاموش بیٹھا ہے، آج کامل ایک ہفتہ سے صفیہ کی آنکھ سے آنکھ نہیں لگی، سوائے چند گھونٹ پانی کے کھیل تک اس کے منھ میں اڑکر نہیں گئی، لیکن محبت کی وہ آگ جو تھوڑی دیر کے لئے مردہ میں بھی جان ڈالدیتی ہے، اس کے اندر بھڑک رہی تھی اور وہ بغیر کوئی تکان محسوس کئے ہوئے ذکی کی تیمارداری میں مصروف تھی۔

آدھی رات گذر چکی تھی اور صفیہ تنہا بیٹھی ہوئی گھڑی گھڑی اس کا جسم دیکھتی جاتی تھی کہ دفعتہً ۲ بجے کے قریب اس نے ایسا محسوس کیا کہ بدن اتنا گرم نہیں ہے اور پیاس کی شدت میں بھی کمی ہے۔ دس منٹ کے بعد پھر اس نے دیکھا۔ پانچ منٹ نہ گذرے تھے کہ پھر اس نے نبض پر ہاتھ رکھا، یہانتک کہ اب وہ ہر منٹ پر اس کا جسم دیکھتی تھی اور جب صبح ہوتے اس کو یقین ہو گیا کہ بخار واقعی کم ہو رہا ہے، تو ایک ایسی مسرت کے ساتھ جو دنیا میں کبھی اس کو حاصل نہ ہوئی تھی دوڑتی ہوئی عزیز کے پاس گئی اور کہا کہ جاکر فوراً ڈاکٹر کو لاؤ۔ ڈاکٹر آیا تو اس نے دیکھکر کہا کہ آج اکتالیسواں دن ہے اور بخار شام تک اتر جائے گا، لیکن کمزوری اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ وہ خود مرض بنگئی ہے اس خبر نے صفیہ پر جو اثر کیا وہ بارش خشک کھیتی پر بھی نہیں کرتی۔ اس مژدہ نے ان کے حوصلوں میں جان ڈالدی امید و نے پھر خون کو رگوں میں دوڑا دیا، اور گھر کی سوگوارانہ حالت دفعتہً مسرت سے تبدیل ہو گئی۔

. . . .

. . . .

ذکی:۔ "آپ جانتی ہیں کہ میں آپ کا کوئی نہیں"

صفیہ :۔" میں جانتی ہوں کہ آپ میرے سب کچھ ہیں اور مجھے آپ کی بیوی ہونے کا فخر حاصل ہے "

ذکی :۔" غلط نہ آپ اس وقت تک حقیقی معنی میں میری بیوی تھیں اور نہ میں آپ کا شوہر، لیکن آج رات کی اس تنہائی میں آسمان کے تاروں کو، فضا کے سکوت کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں اس وقت آپ سے پھر نکاح کرتا ہوں اور یہی میرا " ازدواج مکرر " حقیقی ازدواج ہے جس کے ذریعہ سے میں اپنے آپ کو صفیہ کی پرستش کے لئے وقف کرتا ہوں اور ...."

صفیہ نے ہنسکر ذکی کے منھ پر ہات رکھدیا اور بولی کہ دیکھئے آپ پھر اس بیان کے ساتھ شاعری کو ملائے دیتے ہیں اور مجھے پھر ڈر معلوم ہوتا ہے کہ ...."

اس مرتبہ ذکی نے صفیہ کا منھ بند کر دیا، لیکن ہات سے نہیں ——————— !

نیاز

ارہر کا کھیت!

وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جنمیں کھوئی ہے

دیہات میں ارہر کے کھیت کو وہی اہمیت حاصل ہے، جو ہائڈ پارک کو لندن میں ہے۔ دیہات اور دیہاتیوں کے سارے فرائض منصبی احتیاجات فطری، اور حادثات معاشرتی یہیں پیش آتے ہیں۔ ہائڈ پارک کے خطیب مشہور ہیں، لیکن لوگوں کو نہیں معلوم کہ اسکی داغ بیل ہندوستان کے ارہر کے کھیت ہی میں پڑی تھی۔

پارلیمنٹ اور کونسلوں کی ہیر پھیر اور چیر پھاڑ جوان دنوں "رقص پروانہ" اور "پرفشانی شمع" سے زیادہ گرمی محفل کا باعث تصور کی جاتی ہیں وہ صداہائے بازگشت ہیں جو شاید سب سے پہلے کسی "اکبر الصوت" نے ارہر کے کھیت سے بلند کی تھیں۔ ہائڈ پارک کی خوش فعلیاں اکثر آرٹ یا اس کی عریاں بندی پر ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن ارہر کے کھیت کی عریانیاں اکثر و اثر لوبر تمام ہوتی ہیں۔ یورپ کی عورتوں کو حقوق طلبی کا خیال بہت بعد میں پیدا ہوا لیکن ارہر کے کھیت میں کتنی گاؤں والیاں مسز پنکھرسٹ کی پیشرو گذر چکی ہیں۔ یہ دیہاتیوں کی اسمبلی ہے جہاں عورتوں اور بچوں کو گاؤں کی انتظامی حکومت میں اتنا ہی دخل ہوتا ہے جتنا ہندوستانی پارلیمنٹ میں اراکین پارلیمنٹ کو۔ دونوں بولتے ہیں، ضد کرتے ہیں جھگڑتے ہیں، روتے ہیں اور اپنے اپنے گھر کا راستہ لیتے ہیں۔ دیہاتی عورتیں اور بچے کچھ اور مفید کام کر جاتے ہیں، جس سے ان کو اور کھیت دونوں کو فائدہ پہونچتا ہے اور ہندوستانی اراکین پارلیمنٹ وہ کرتے ہیں جس سے ان کو اور ہندوستان دونوں کو نقصان پہونچتا ہے، ایک قضائے حاجت کرتا ہے اور دوسرا ——— نان کوآپریشن

شام کا دھندلکا اور گاؤں کا دھواں گہر آلود ہو کر پھیلنے لگتا ہے۔ کتے بھونکنے لگتے ہیں۔ کسان اور ان کے تھکے ہوئے مویشی ایک دوسرے سے سرگوشی کرتے ہوئے دیہات کو واپس ہوتے ہیں گویا دونوں ایک ہی مسئلہ پر غور کر رہے ہیں۔ یعنے گھر پہونچکر کھانا ملے گا، سونے کو ملے گا اور عافیت ملے گی۔ ان کے مقابلہ میں دن کی محنت ہر حیثیت سے دلآویز تھی۔ اور دوسرے دن کی مشقت خوش آیند۔ مویشی اور مالک دونوں کا خاندان ایک ہی ہوتا ہے اکسان کی بیوی، اس کے بچے بچیاں اور اسکا بوسیدہ جھونپڑا، کسان کے لئے اتنا ہی عزیز ہوتے ہیں جتنا خود مویشی کے لئے۔ کسان اور مویشی دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں، اس لئے زندگی کے نشیب و فراز سے بے خبر یا مستغنی ہوتے ہیں۔ غرض کسان کتنا ہی فلاکت زدہ کیوں نہ ہو وہ آجکل کے روشن خیال میاں بیویوں سے زیادہ خوش قسمت ہے۔ خوش قسمت نہیں تو مسرور سہی!

لیکن وہ دیکھئے گا، گاؤں کے قریب والے کوئیں کے سامنے سے ایک راستہ کھیت کی سمت گیا ہے، ایک طرف گڈھا سا ہے جس میں کھاد پڑی ہوئی ہے، دوسری طرف ایک ببول کا کھوکھلا پرانا درخت ہے۔ جیسے کوئی شمشاد سالہ وکٹوریہ کراس تمغہ یافتہ، جو ایک آدھ شب زندہ دار بزر

اس طور سے بیٹھے ہوئے گردوپیش کا جائزہ لے رہے ہیں جیسے جنگِ عظیم کے اختتام پر یورپ کے بعض فرزندانِ قسمت شاخ زریں پر بیٹھے ہوئے گردوپیش کا جائزہ لے رہے تھے۔ عورتوں کی کچھ تعداد کوئیں پر جمع ہوئی۔ یہاں کچھ دیر تک مزید کمک کا انتظار کیا گیا۔ ان میں جو جوان تھیں۔ پرشباب لیکن بے خطر کوئیں کی جگت پر تھیں یا دس لٹکائے ہوئے کچھ گنگناتی ہوئی۔ بدبو بوڑھیوں کو دعوت تہدید و عتاب دیتی ہوئی۔ کچھ بوڑھیاں تھیں جو جگت کے نیچے بیٹھی ہوئی کراہ رہی تھیں، گالیاں دے رہی تھیں اور کھانستی جاتی تھیں۔ اتنے میں ایک اور گروہ آپہونچا، نوجوان جگت پر بیٹھنے والیوں نے اپنی ہمجولیوں کا شوخی وطراری سے، اور بوڑھیوں نے کوسنے، گالی اور کھانسی سے خیر مقدم کیا۔ اکہری قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے یہ مجمع کھیت کی پگڈنڈی پر ہو لیا۔ جسموں کو توتے ہوئے۔ نوجوان لڑکھڑاتیں تو ایک ہلکی سی چیخ اور بلند قہقہہ کے ساتھ سنبھل جاتیں۔ بوڑھیوں کا قدم ڈگمگاتا، تو زمیندار اور کسان جس کا کھیت حاشیہ پر ہوتا، موسم، پاس کا لڑکا یا لڑکی یا قہقہہ لگانے والی عورت گالیاں سنتی ــــ یہ مہم چلتے چلتے ایک تاریک ناقابل گذار، اندیشہ ناک اور خار دار سدِ رویں کے سامنے رک گئی۔ یہ دیہاتی مجمع کے قلعے تھے

برسوں گذرے ہیں اسی دشت کی سیّاحی میں

لیکن بعض ثقات جس کا شاید نام لینے سے گھبرائیں ــــــــــــ ارہر کا کھیت!

ناظرین سمجھ گئے ہوں گے یہ لشکر کس مہم پر روانہ ہوا تھا۔ یہاں وہ سب کچھ ہوگا جس کے لئے ہم چوری یا مار کھاتے ہیں۔ یہیں سے شاعری کا اختتام اور تعزیرات ہند کا آغاز ہوتا ہے۔ یہیں حفظانِ صحت کے جراثیم ملتے ہیں۔ یہاں آنے پر معلوم ہوگا کہ بہت سے منچلے یا مظلوم پہلے سے پہونچ چکے ہیں کسی کا "آرام جاں" اور "مونس قلب" بچھڑ گیا ہے وہ اس کے لئے افتاں وخیزاں یہاں تک پہونچا ہے اور کسی سے وعدۂ دید و اندکے مزید کا قول وقرار ہے، وہ سراپا شوق چلا آرہا ہے، اور ــــــ کسی کا گدھا کھو گیا ہے، وہ بھی بھٹکتا ہوا آن پہونچا ہے۔ یہ اس بھول بھلیاں کا کرشمہ ہے کہ بچھڑے یہاں ضرور ملتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کبھی گدھے والے کے ہاتھ عشاق کی گردن پر ہوتا ہے یا خود گدھا کسی محبوبہ کے پہلو میں۔ آخر یورپ کے ازمنہ وسطےٰ میں (masqurade) ماسکوریڈ یا جشن "نقاب پوشی" کیا تھا جس پر یورپ والے ناز کرتے ہیں اور ہم روتے ہیں، یا گالیاں دیتے ہیں۔ ہندوستان کی سرزمین صرف دو چیزوں کے لئے موزوں ہے، مہابھارت یا ارہر کا کھیت، مہابھارت تو شاید اختتام پر ہے، سائمن کمیشن کی سفارش اور ارہر کے کھیت کا ادرانتظار ہے!

جوانی کا کھونا اور وہ بھی ارہر کے کھیت میں، ایسا مسئلہ ہے جس پر ناک بھوں پر زور دینے سے پہلے، دل و دماغ پر زور دینا زیادہ ضروری ہے ہندوستان میں جوانی کا انجام دو طریقوں پر ہوتا ہے۔ اکثر شفاخانہ میں ورنہ جیلخانہ میں۔ جیلخانہ کا راستہ تو اکثر ارہر کے کھیت ہی سے گذرتا ہے اور شفاخانہ کا شہروں کی صاف، شفاف سڑکوں سے جس پر سے موٹر بھی گذرتے ہیں اور مولوی بھی۔ یہ ہندوستان کی بدنصیبی ہے کہ ہمارے نوجوانوں نے امراض شباب کے لئے شفاخانوں کو جیلخانوں پر ترجیح دی۔ زندگی کے آثار آپریشن ہال کے نشتر سے زیادہ جیلخانہ کے ڈنڈے میں پائے جاتے ہیں۔ شفاخانہ سے زندگی اور جیلخانہ سے موت گھبراتی ہے۔

شباب اور مفلسی کا اجتماع اتنا ہی بے کیف ہے جتنا بے مرچوں کا سالن یا بے تمباکو کا پان، مانا، کہ مرچ اور تمباکو مضر صحت ہیں لیکن تندرستی کا مصرف تحفظ تندرستی نہیں بلکہ اس سے لطف اندوز ہونا ہے۔ شباب میں پیرانہ سالی کا لطف (اگر اسے لطف کہہ سکتے ہیں) اٹھانا ممکن ہے لیکن پیرانہ سالی میں شباب کا کیف کیسے پیدا کیا جاسکتا ہے۔ شباب اور پیری دونوں حالات منتظرہ ہیں، ایک کا مقصود انتظار "دشمن ایمان و آگہی" یا "رہزن تمکین و ہوش" ہے دوسرے کا ——— ؟

لیکن یہ ستم ظریفی ہندوستان کے مطالبہ آزادی سے زیادہ دلچسپ ہے کہ شباب ایک طرف تو عقل سے شرمسار ہونے پر ضد کرتا ہے اور دوسری طرف سب کا انتقام بھی پورا پورا لیتا ہے۔

ارہر کے کھیت میں عقل سے شرمساری کی نوبت آتی ہے تو گاؤں والے بسولے سے کام لیتے ہیں اور عدالت رندے سے خبر لیتی ہے،

کسی منچلے شہری کا ارہر کے کھیت میں دیہاتیوں کے ہاتھ سے مار کھانا اتنا ہی دلچسپ اور شاید عبرت آمیز منظر ہے جتنا کسی پبلک مشاعرہ میں، بھلے مانس شاعر کا اپنا کلام سنانا!

دیہاتی سمجھتا ہے کہ جب تک زمیندار اور پٹواری موجود ہیں اس کی ساری ملکیت منقولہ ہے الا عورت، شہری اس کا قائل ہے کہ جب تک یورپ اور دولت حتیٰ و قائم ہیں اس وقت تک سب کچھ غیر منقولہ ہے الا عورت۔ دیہاتی عورت کو مایۂ عزت سمجھتا ہے اور شہری آلۂ تفریح۔ دیہاتی کے نزدیک عورت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس کا مکان ہے جہاں وہ ہنستا ہے، بولتا ہے، آرام کرتا ہے پناہ لیتا ہے اور کشاکش حیات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تازہ دم ہو کر نکلتا ہے، تعلیمیافتہ کے نزدیک عورت ایک عضویاتی ضرورت ہے یا ایک وسیلۂ تفنن جس کیلئے اس نے چوپاٹی اور اپالو تعمیر کیا ہے۔ دیہاتی پناہ اور آرام چاہتا ہے، شہری صرف غم غلط کرنا چاہتا ہے، دیہاتی کے یہاں محنت دیانت اور عورت ہے، شہری بھی عورت کا طالب ہوتا ہے، لیکن محنت و دیانت سے نہیں، بلکہ مکر و دولت سے آج چوپاٹی اور اپالو در بابرد ہو جائیں تو وہ جلد سے جلد کوئی اور چوپاٹی اور اپالو تعمیر کرے گا، کسان کے جھونپڑے پر یہ آفت آئے تو یہاں سطح آب پر اپالو اور چوپاٹی کی خس و خاشاک پراگندگی نظر نہیں آسکتی بلکہ موجوں کے ساتھ ایک خفیف سی ہلکی رنگین تحریر ——— ! چوپاٹی اور اپالو کی تعمیر دولت اور مشین سے ہوتی ہے، یہ ایک لحظہ میں تعمیر ہوتے ہیں اور اپنے تعمیر کرنے والوں کی دولت اور حسن کی مانند ایک لحظہ میں فنا ہو جاتے ہیں، جھونپڑا نسلوں کی تعمیر ہے اور نسلوں کے فنا ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتا ہے!

ارہر کا کھیت دیہات کی زنانہ پالیمنٹ ہے، کونسل اور اسمبلی کا صور یہیں سے پھونکا گیا تھا۔ گاؤں کا چھوٹا بڑا واقعہ سب یہاں معرض بحث میں آتا ہے۔ فلاں کی شادی کب اور کہاں ہو رہی ہے، داروغہ جی کیوں آئے اور کیا لیکر گئے۔ پٹواری کی بیوی نے اس سال کون کون سے نئے زیور بنوائے۔ رگمنیا کے بچہ کیوں نہیں پیدا ہوتا، اور سکھیا کو حمل کیسے ٹھیرا، ایک نے کہا میری گائے کے بچھیا ہو گی، دوسری بولی پہلوٹی کی بچھیا ہو چکی ہے، اسکے بچھوا ہو گا، اسپر اختلاف آرا ہوا، اور ہندوستانی لیڈروں کی طرح دونوں بھول گئیں کہ ہم دراصل کس شغل میں مصروف تھے "اور اب کیا ہو رہا ہے"،

اندھیرے میں گالی گلوج موثر نہیں ہوتی، دونوں آگے بڑھیں، ایک کا پاؤں اور دوسرے کا ہاتھ، "لعوق حفظان الصحت" پر پڑا اور پڑتے ہی غصہ کا سیلاب دوسری جانب مائل ہوگیا، دونوں یکلخت اس نتیجہ پر پہونچیں کہ یہ منیا کے لڑکے ملندیا کا فعل تھا، دونوں نے ملندیا کو بہانگ دہل کوسا، یہ گویا منیا کو اعلان جنگ تھا، منیا نے بیٹھے ہی بیٹھے للکارا، ملندیا گھبرا کر اپنی ماں کی تلاش میں بھاگا، فریقین اول میں سے کسی کے اوپر جا گرا، دونوں چیخ پڑیں، منیا نے مار ڈالا، اب کیا تھا، سب نے اپنا اپنا شغل جہاں کا تہاں چھوڑا۔ نہ "مخشک طہارت" کا خیال رہا نہ ترنجاست کا، ایک غوغا بلند ہوا، بھگدڑ مچ گئی، کھیت کے چاروں طرف سے لوگ نکلنے لگے، مرد، عورت، بچے، گیدڑ، کتے۔ بٹیریں، لومڑی، نیولا، بن بلاؤ ——— گویا اسمبلی میں بم گرا!

ایک روز ہمکو یکلخت معلوم ہوا کہ ہم کوئی نصف گھنٹہ مقررہ وقت سے پہلے کلاس پہونچگئے ہیں۔ بحیثیت لکچرار کلاس میں تنہا پایا جانا، پانے والے کے لئے اتنا ہی دلچسپ اور بصیرت افروز ہے، جتنا کسی آثار قدیمہ دریافت کرنے والے کو ایک لاکھ برس قدیم انجہانی گینڈے کا ڈھانچہ مل گیا ہو۔ ایسی حالت میں ہر اس گذر جانے والے کو مخاطب کرنا اور طوعاً و کرہاً اس سے اظہار خلوص یا برتری کرنا ضروری ہو جاتا ہے جس کے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ یہ ہماری ہیئت کذائی پر سوچنے کا اہل ہے۔ اس اثنا میں ایک کتا سامنے سے گذرا، اور ہمنے بیٹھے ہی بیٹھے ایسی ڈانٹ بتائی اور آمادۂ "نقض امن" ہوئے گویا اردو پڑھانے کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی نے ہم کو کتوں کے استیصال کے لئے تھانہ دار بنا دیا تھا۔ اتنے میں ایک بہشتی گذرا اور ہمنے انتہائی سرپرستانہ لہجہ میں پوچھا، کیوں اس طرف کا دروازہ کھل جانے سے تم لوگوں کو طے مسافت میں بڑی آسانی ہو گئی ہوگی، اس نے نہایت انکسار اور تشکرانہ انداز میں ہامی بھری، ابھی یہ رسمی تکلفات ختم نہوئے تھے کہ ایک خوانچہ والا سامنے آ گیا، بولا: میاں اس دروازہ کی کنجی آپ ہی کے پاس رہتی ہے، دروازہ کھلنے سے بڑا آرام ہو گیا، (خوانچہ کے اندر، جو ابھی سر ہی پر رکھا ہوا تھا، کچھ ٹٹولتے ہوئے) خدا آپ کو سلامت رکھے، یہ لیجئے بریلی کا بڑا تحفہ امرود ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ حکام یونیورسٹی نے معلمین کے لئے کس مصلحت کی بنا پر گاؤن پہننا لازمی کر دیا ہے۔ لیکن ابھی ہمارا غصہ اور سکوت، خوانچہ والے اور "بریلی کے تحفہ امرود" کے درمیان پورے طور پر متوازن نہیں ہونے پایا تھا کہ ایکطرف سے "حاجی بلغ العلی" کچھ گنگناتے ہوئے اس طور پر جھپٹتے ہوئے نکلے گویا کملی اور داڑھی کے علاوہ

عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے!

حاجی صاحب کا عربی نام "بلغ العلی" اور فارسی "جریب زیتونی" ہے۔ کچھ لوگ "سابق دیوانہ ہمدرد" اور حال "ابو المجنون" کہتے ہیں۔ کچھ دنوں "حشت البزازیہ" پر زور لگاتے رہے اندنوں "قانون مسعودی" کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اس کے بعد کا پتہ نہیں کہ اب جنون کی کیا حالت ہے۔

ملتے ہی فرمانے لگے، جلدی سناؤ جلدی، میں نے کہا کیا، فرمایا کوئی اچھا سا شعر، میں نے کہا سنئے:—

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل پڑے
یہ مری جبین نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

گردن ہلا کر، بجلوہ ریزی "کمل" و "بر پر فشانی" ریش اپنے سکوت کا ثبوت دیا،

میں نے کہا کوئی موضوع بتائیے تو مضمون لکھوں، فرمایا:۔

"ارہر کا کھیت!"

میں نے دریافت کیا کیوں جناب اس شعر کا یہ معاوضہ، سخن فہمی کی داد دوں ۹ کل کو حاجی صاحب نے جناب "کراما" کے سر سے اٹھا کر مولنا "کاتبین" پر ڈال دیا (میں نے سہولت کی خاطر ان "تسمہ پا" بزرگوں کے نام علیحدہ کر دیئے ہیں، اگر کوئی صاحب ان کے نام ونشان، حسب نسب، وطن اور مشاغل کے بابت اپنا ذخیرہ معلومات وسیع کرنا چاہتے ہوں تو نیاز صاحب سے رجوع کریں، مجھے امید ہے نیاز صاحب باب الاستفسار کے جن نمبر میں اس پر اظہار خیال فرمائیں گے، مجھے اندیشہ ہے کہ باب الاستفسار اور جن نمبر میں بھی کراما کاتبیں کے مانند مجھ سے کچھ خلط مبحث سرزد ہو رہا ہے) فرمایا نواب صاحب کہاں میں گے، میں نے کہاں کون نواب نواب مزمل اللہ خاں صاحب، کیا یہ شعر سنائیے گا، کہنے لگے، نہیں جی، وائس چانسلر صاحب، نواب مسعود یار جنگ بہادر، میں نے کہا ان کو سنانا ہے تو میرا یہ شعر سنائیے گا۔

تراکہ ہر در بازوے تیغ زن باقیست
بگیر تیغ کہ آن حسرت کہن باقیست

فرمایا، یہ کیا، میں نے کہا یہ یہ ہے

من آں علم وہنر را بپر کاہے نمی گیسدم
کہ از تیغ وسپر بیگانہ سازد مرد غازی را

حاجی صاحب قبلہ نے کچھ گھبرا کر کچھ بے اختیار ہو کر فرمایا، ارے میاں، یہ سب تو ہوا، اب کیا ہو، اچھا تمہارے کلاس میں بیٹھ جاؤں، ذرا تمہارا لکچر سنوں گا، میں نے کہا، اور کلاس کی ڈسپلن کا کون ذمہ دار ہوگا، فرمایا، السلام علیکم اور میں ڈنڈا لئے ہوئے کلاس میں پہونچ گیا۔

"اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا"

(۱) اگر مضمون اچھا ہے تو میں ذمہ دار

(۲) اگر عنوان برا ہے حاجی صاحب ذمہ دار

(۳) اگر کتابت وغیرہ کی غلطی ہے تو نیاز صاحب ذمہ دار

(۴) اگر کل برا ہے تو ناظرین ذمہ دار

خط وکتابت "وترسیل زر" میں ان امور کا لحاظ رکھا جائے۔

رشید احمد صدیقی (ایم۔ اے) مسلم یونیورسٹی

جلوۂ کرشن

جسودھا کی گود میں نشو و نما پانے والے کو کون نہیں جانتا۔ نند کے آغوشی فرزند کو کون نہیں پہچانتا۔ دیوکی کے لاڈلے اور واسدیو کے صُلبی فرزند سے کون واقف نہیں۔ متھرا کے کنہیا کا سکہ کون ہے جس کے دل پر بیٹھا ہوا نہیں ہے!! بانسری کی دلکش پکار کس کو متوالا نہیں بنادیتی۔ بندرابن کے عاشقانہ ذرات اب بھی گوپیوں کے لئے افشاں کا کام دے جاتے ہیں۔ غرض کہ ہند میں ہزاروں سال سے اسی کا ترانہ ہے اور اسی کی جے کے نعرے، ہر مندر اسی کی جلوہ گاہ ہے اور ہر پجاری کا دل اسی کی حریم ناز! بچپن کا موسم محبت میں۔ جوانی کی فصل عاشقوں کی جھرمٹ میں اور موت کمبخت بھیل کے ترکش میں۔ جس نے اسے پرستش کے قابل بنادیا۔

بھادوں کی تاریک گھٹاؤں میں، کال آگرہ محل کے زندان میں، دیوکی کے خوبصورت پیٹ سے وہ جنم لیتا ہے، جس کے گلے میں جینے کیلئے مالا اور راجدھانی کے لئے سر پر "مکٹ" (تاج) کا قدرتی خلعت تھا، یہ آثار دیکھکر دیوکی کی آتما مسرت سے لرز گئی، واسدیو کا قلب کنس کے ظالمانہ سلوک سے تھرا گیا، آٹھواں مولود تھا اور یہی ان دونوں کا آخری سہارا! واسدیو نے ٹوکرے کی آغوش میں اس ننھی سی جان کو ڈالا اور اپنے پیروں کی آہٹ کا احترام کرتا ہوا زندان کے دروازہ سے نکلا جمنا کو عبور کیا اور گوکل میں پہونچ کر جسودھا کی معصوم پرور آغوش میں سونپ دیا۔

جس کی زندگی دیوکی کے پیٹ سے انسانیت کا پیام لیکر نکلی تھی۔ وہ خوش اس لئے تھا کہ اس کو پرماتما نے ۹ سال زندہ رکھنے کے لئے پیدا کیا تھا۔ ورنہ کنس کے ہندی تو ہمات پہلی سانس بھی نہ لینے دیتے۔ اس کو تو ارجن کا رتھ بان بننا تھا اور مہابھارت کے معرکۂ کارزار میں بقائے روح کا فلسفہ سمجھانا تھا وہاں یہ کہنے والا اور کون تھا کہ:۔

"جسم کا ناش ہوتا ہے مگر آتما امر اور غیر فانی ہے"

متھرا سے کوئی پوچھے، جس نے اس کے بچپن کی شوخیاں دیکھیں۔ بندرابن سے کوئی سوال کرے کہ واسدیو کے لخت جگر کی جوانی تیری مست فضا میں کیونکر مچلی۔ بنارس کے پنڈت شاستری بتا سکیں گے کہ انہوں نے اپنے سپوت کو علوم و معارف کے کون کون سے سبق دیئے۔ دوارکا کی غیر آباد سرزمین اس کی بیدار زندگی کے کارنامے بیان کرسکے گی۔ مجبت کرنے والی رکمنی کہہ سکے گی کہ کندن پور سے آغوش محبت میں لے جانے والا کون تھا۔ گنگا کی موجیں گواہی دے سکیں گی کہ اس نے اپنی چادر سیال سے ہند کے دیوتا کے عریاں جسم کو کس طرح ڈھانکا تھا۔

ہند کا یہ اوتار موسیقار بھی تھا اور رقّاص بھی۔ اپنی بانسری کی روح پرور صداؤں سے زندگیوں کی مضمحل نبضوں میں حیات کی بجلیاں بھر دیتا تھا اور اپنی جوشیلی تقریروں سے سرفروشی کے لئے تیار۔ اس کے روح پرور نغمے۔ اس کا دلنواز رقص۔ اس کی جانگداز بانسری اور اس کی فلسفیانہ سحر بیانی یہ ایسی آبی ہوئی تلواریں تھیں جو اس کے حلقہ بگوشوں کے دلوں کو دو نیم کردیتی تھیں۔

مہاراجہ سری کرشن نے اپنے شائستہ عادات و اطوار، اپنی سانچے میں ڈھلی ہوئی سیرت اور تعلیم و تلقین سے جو نتائج و اثرات صفحۂ ہند پر چھوڑے تھے، وہ ان کی عظمت کو منوائے بغیر نہیں رہتے۔ ان کی ۹۰ سالہ زندگی "ایشور پرستی" ہی میں گذری۔ ان کا مشرب موحدانہ تھا۔

ان کا مسلک صوفیانہ تھا۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ غرق تھا ادائے فرض میں، دھرم پر ایقان رکھنے میں، اوقات کی پابندی میں، ثبات قدمی میں انسانیت کے احترام میں۔ اور رحم و ہمدردی کے انسانی صفات میں!۔

گو امتدادِ زمانہ نے حقیقت پرستی میں اوہام پرستی کی آمیزش کر دی اور اصلیت کو مسخ کر کے رکھدیا، کیونکہ مہاراجہ سری کرشن خود پرست برہمنوں کی طرح نہ اپنے علم و فضل پر ناز کرتے تھے اور نہ اپنی ہستی کو اپنے ہم جنسوں سے بالاتر سمجھتے تھے۔ وہ چھتریوں کی طرح نہ اپنے شجاعانہ کارناموں کا ڈھنڈورا پیٹتے تھے۔ نہ ویشوں کی طرح دولت سمیٹنے کی دھن میں لگے رہتے تھے، اور نہ شدروں کی طرح اپنی انسانیت کی خود توہین کرتے تھے وہ انسانیت کو خدا کا اولین عطیہ سمجھتے تھے اور خود وہ انسانیت ہی کے حامل بنکر آئے تھے، اور انسانیت ہی پر قایم رہنے کے لئے "انسانوں" کو سبق دیئے تھے۔ مگر افسوس کہ ناقص اور باسی دماغوں کی پیداوار نے اس کو یکسر بھلا دیا اور "ذات پات" کی تفریق اور "چھوت چھات" سے کراہت پیدا کر کے انسانیت کو مجروح کر دیا اور اس پہ بوالعجبی کہ اس کو اپنے دماغ کا بہترین کارنامہ بھی سمجھا۔ کاش تخلیق کی غایت پر غور کرتے اور انسانیت کا جنازہ اپنے کاندھوں پر نہ اٹھاتے!! آج ہندوستان اسی دماغی مرض میں شدت سے مبتلا رہ کر سوراج کیلئے گدایانہ سوال کر رہا ہے۔

بھگوت گیتا کے مصنف کی زندگی ۹۴ سال تک جنگ و پیکار ہی میں گذری۔ کنس کو چودھویں سال میں پچھاڑ کر دنیائے ہندوستان کو اس کے ناقابل برداشت مظالم سے نجات دلادی، جراسندہ کا مقابلہ اس نے کیا۔ کرناٹک اور بنارس کی مہمیں اس نے سر کیں۔ شسپال سے یہ نبرد آزما رہا۔ مہابھارت کے خونیں مناظر اس کی آنکھوں نے دیکھے اور درد پدی کے سوئمبر میں ارجن کی تیراندازی پر صدائے تحسین اُس نے بلند کی۔

اس کی زندگی کے حالات نظم و نثر میں کثرت سے شایع ہو چکے ہیں۔ جس میں غالیانہ عقائد کی وجہ سے مبالغہ آمیز افسانوں کی بھرمار ہے اور خود محبت نے حسن و قبح کا امتیاز بھی سلب کر لیا ہے۔ معلوم ہو رہا ہے کہ دماغی جہالت نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ بیسویں صدی حیدرآباد کے "کرشن" کی شاعرانہ طبیعت کا دریا موجیں مارتا ہے۔ صرف اس عقیدے کو لئے ہوئے کہ یہ بھی اسی کے نام پر ۶۵ سال سے زندہ ہے، گو شاد ہے مگر زمانہ کی رفتار اور اپنی افراط شرافت سے ناشاد۔ گو خاندانی امیر ہے مگر اپنی ذات سے فقیر! نام کی برکت ہزاروں سال کے گذر جانے پر بھی اس حد تک تو باقی رہی کہ واسدیو کا "کرشن" ہند کا بادشاہ تھا۔ چندولال کا "کرشن" دکن کا وزیر ہے۔

مہاراجہ بہادر بالقابہ کی امیرانہ طبیعت کو شاعری کے ساتھ بچپن سے لگاؤ ہے۔ مہاراجہ چندولال شاداں کا شادانی دربار شعراء سے ہر وقت بھرا رہتا تھا۔ جس میں نصیر دھلوی کے سے استاد داد سخن دیا کرتے تھے۔ مہاراجہ شاد کے شاعرانہ دربار میں بھی سرشار مست رہا کرتے تھے، اور داغ بھی یوں نواسنج رہتے تھے کہ ع

آئے گی اردو زباں آتے آتے

جلیل و اختر بھی برسوں اس خوان کرم کے زلہ ربا رہے ہیں۔ ضیا کی ضیا باریاں بھی مشاعروں کو جگمگا دیا کرتی تھیں۔ اور نخوی کی شاعرانہ نخویت اب بھی ہر جمعہ کو نظر آجاتی ہے۔ ثاقب نے بھی اپنی پہلوانی کے شاعرانہ داؤ پیچ دکھائے ہیں اور غبار کی ضعیفی تو ابتک حضرت شاد ہی

کے دامن سے لپٹی ہوئی ہے، اور مشق سخن مصروف۔ بیگم کے بڑھے غمزے اب بھی ناک پر انگلی رکھ کر "طلائی چوڑیوں" کا خیال پیدا کرا دیتے ہیں۔ جہاں کی فضا ایسی شاعرانہ ہو۔ وہاں تو غیر موزوں طبیعتیں بھی موزوں ہو جاتی ہیں۔ نہ کہ مہاراجہ شاد جنھوں نے آنکھیں کھولتے ہی گھر میں شاعری کا چرچا سنا۔ کیونکر چپ رہتے۔ میدان شعر میں بے تکان دوڑیں لگانا شروع کر دیں۔ قوالوں کے گلے ان کی غزلوں سے حرکت کرنے لگے، رباعیات و قطعات کے بارے میں انکی جستیں حیرت کرنے کے قابل ہوگئیں۔ قصائد سے ان کا زور بیان ٹپکنے لگا۔ اور مثنوی سے واقعہ نگاری کی قابلیت معلوم ہونے لگی۔

اسی "جلوۂ کرشن" میں اپنا مسلک یوں نظم فرماتے ہیں:۔

ہے میرا طریق صوفیانہ — توحید ہے بس مرا ترانہ
میں کیا کہوں کون ہوں میں کیا ہوں — اک آیت قدرت خدا ہوں
صوفی ہوں موحدانہ مسلک — کی میں نے نہ بت پرستی اب تک

مہاراجہ سری کرشن ماں کے پیٹ سے چندر بنسی اور باپ کے نطفہ سے سورج بنسی پیدا ہوئے تھے، اس بیان کے دو شعر اس مقدمہ میں سن لیجئے:۔

یہ قہر کا گرم آشیانہ — وہ مہر کا سرد آستانہ
تریاق بھی اور زہر بھی تھا — تھا مہر بھی اور قہر بھی تھا

سری کرشن کی پیدائش کے وقت مہاراجہ شاد کے شاعرانہ دماغ کی موزونیت ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہے:۔

نقارۂ رعد بج رہا ہے — بادل اٹھ کر گرج رہا ہے
ہشیار کہ شیر کی ہے آمد — عالم کے دلیر کی ہے آمد
بنیاد ستم کی ڈھانے والا — احکام خدا سنانے والا
پیدا ہوا ایشور مبارک — پورا ہو دعا مبارک
گلچیں کی کہیں نظر نہ لگ جائے — اس گل کی مہک لگ لگ جائے

کنس کے درباریوں کے حاسدانہ طبائع کو ایک شعر میں کس لطیف استعارہ میں ظاہر کیا ہے:۔

حُسّاد کی دال گلی نہیں تھی — زہریلی ہوا تھمی نہیں تھی

کرشن مرلی کے موسیقیت کا سحر ان اشعار میں دیکھئے:۔

وہ اسکی رسیلی تانیں دلکش — سنکر جسے سننے والے ہوں غش
گوکل گوالنیں ہیں بیدم — ہے مستی و بےخودی کا عالم
ہر تان پہ سب جگر کو تھی تھیں — سب شیام سندر کو تک رہی ہیں
تھی معجزہ بانسری کی آواز — فوق العادۃ تھا سوز میں ساز

کچھ ایسا سماں بندھا ہوا تھا　　سبزہ بھی زمیں پہ لوٹتا تھا
من موہ لیا بجا کے مرلی　　تھی شیام کی تان کیا رسیلی

کنس کے اکھاڑہ کا منظر۔ کرشن و بلرام کی آمد۔ مست ہاتھی سے مقابلہ۔ حاضرین کا خوف و ہراس اور کرشن و بلرام کے شجاعانہ کارنامے انکی تصویر شعر کے قالب میں دیکھئے:-

میدان میں پہلواں کھڑے تھے　　دو بچوں کی جان پر اڑے تھے
ہتھیار ہر ایک تولتا تھا　　تلوار کا ڈورا کھولتا تھا
تھا یاں تو دھکڑ پکڑ کا عالم　　ناگاہ کھلا ظفر کا پرچم
وہ گرد اٹھی غبار چھایا　　ہر شخص نے اپنا سر اٹھایا
دامن ہوا چاک گرد کا جب　　دو مہ نکل آئے آخر شب
میداں میں جب آئے شاہزادے　　تکتے تھے سوار اور پیادے
پہلے ہی سے یہ کھی بدی تھی　　اک سمت سے چھوٹا مست ہاتھی
سب جان چرا کے اپنی بھاگے　　بڑھ آئے کرشن سب سے آگے
تلوار لئے اڑے رہے وہ　　جس جا تھے کھڑے کھڑے رہے وہ
جب آیا قریب مست ہاتھی　　اک وار میں سونڈ کاٹ ڈالی
چنگھاڑ کے فیل مست بھاگا　　پیچھا دیکھا نہ اس نے آگا

کرشن و بلرام کی دیو پیکر پہلوانوں سے کشتی۔ کرشن کا غلبہ۔ تماشائیوں کا حیرت بدنداں ہونا اسکو نظم فرماتے ہیں کہ:-

آئے جو مقابلہ کو دشمن　　گردانا کرشن نے بھی دامن
یاں آتے ہی ان کے چھکے چھوٹے　　لڑکوں کو جو دیکھا دل بھی ٹوٹے
سمجھے تھے کہ ان کی جان لیں گے　　دونوں کو اٹھا کے پھینک دیں گے
لڑتے رہے دونوں بے ارادے　　کھیلا کئے دونوں شاہزادے
وہ پیچ کیا کرشن جی نے　　لی سانس تلک نہ مدعی نے
سینے پہ اسے گرا کے بیٹھے　　اٹھا نہ وہ یوں دبا کے بیٹھے

کنس کے قتل پر وفادار و جاں نثار حاشیہ نشینوں کا سکوت عبرت کے لئے کافی ہے:-

نیرنگی دہر کے کرشمے　　عبرت کے سبق کے ہیں معمّے
آلودہ بخوں تڑپ رہا ہے　　سر تن سے کہیں جدا پڑا ہے
بیجا تھا غرور حکمرانی　　عبرت کی ہے جا جہان فانی

تاج اس کا زمین پر پڑا تھا — جو ظلم کو رحم جانتا تھا
جو تاجوروں کا تاج لیتا — راجاؤں سے جو خراج لیتا
بیجان پڑا ہے سر کٹائے — سب دور ہیں پاس کون آئے
آیا نہ کوئی اسے بچانے — وہ قتل ہوا کھلے خزانے
بے گور دکفن پڑا ہے لاشا — دیکھا کئے سب کھڑے تماشا

کنس کی ظالمانہ زندگی کا خاتمہ کر کے سری کرشن جی مہاراجہ شاد کی شاعرانہ زبان سے اپنے پیرووں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:-

مجھ کو نہیں خواہش حکومت — جائز نہیں رکھتا میں خصومت
ظالم نہیں میں جو خون بہاؤں — غاصب نہیں ہوں جو ملک پاؤں
ظالم سے کیا ہے ملک خالی — یہ پھانس جگر میں تھی نکالی
میرا بھی فرض منصبی تھا — قصہ کروں پاک فتنہ گر کا
میرا جو ہے راج اور ہی ہے — تخت اور تاج اور ہی ہے

مثنوی کا خاتمہ مہاراجہ شاد نے اس دعا پر فرمایا ہے جس پر آپ بھی آمین کہئے:-

او شان ہر اک بدلنے والے — یکتائی کی راہ چلنے والے
او بانسری کے بجانے والے — ہر ایک کا دل لبھانے والے
او زلف سیاہ والے ہیتم — او مظہر لطف رب اکرم
ہے داس ترا یہ شاد صوفی — کرتا ہے نوا کے سیس بھگتی
ناگن ہو کر سگن بنا دے — پردے مری آنکھ سے اٹھا دے
پر کیف بنا سر یہ میرا — جگ میں بجے یہ سرا ہے تیرا
مرلی کی مجھے صدا سنا دے — وہ نغمۂ جانفزا سنا دے
دیکھا نہیں جو سماں دکھا دے — وہ جلوۂ ضو فشاں دکھا دے
درشن دے سکھی رہوں میں — کرپا سے ترے غنی رہوں میں
اس دل کی تڑپ نے مار ڈالا — ارماں نہ مگر کوئی نکالا
سمرن تری جپ رہا ہوں کب سے — دے مجھکو خوشی مری طلب سے
سنتوش ہو من وہ روپ دکھلا — بھگوان ہو جگت کے بس میں آ جا
من کی بپتا تو دیکھ میری — دکھ میں مرے دلکو دے دلیری
میری جو مراد ہے تو یہ ہے — خوش کامی شاد ہے تو یہ ہے

خدا حسن قبول دے اور زور بیان میں قوت، تاکہ آپ کے دماغی شہکار سے دنیائے شاعری ہمیشہ لطف اٹھاتی رہے

ہوش بلگرامی

زندگی

زندگی کی ماہیت اور اس کی علت غائی پر از آدم تا ایندم ہر زمانہ اور ملک میں انسان کچھ نہ کچھ غور و فکر کرتا رہا ہے۔ بظاہر ہم لاکھ آسودہ اور مطمئن ہوں لاکھ ہمارے اقتصادی، سیاسی، دماغی اور دیگر حوصلے پورے ہو چکے ہوں پھر بھی ہمارے اندر آسودگی کا ایک عنصر جراثیم سل کی طرح رہ جاتا ہے جو وقتاً فوقتاً ہماری ساری ہستی پر اس طرح چھا جاتا ہے اور ہماری زندگی کو کچھ اس قدر دردناک بنا دیتا ہے کہ شیلی کی طرح عاجز ہو کر چلا اٹھتے ہیں "واہ ری دنیا! واہ ری زندگی! واہ رے زمانہ!" یا بیدل کے ساتھ بیساختہ یہ کہکر سر پیٹنے لگتے ہیں :-

"چہ بارِ کلفتی اے زندگی کہ ہمچو حباب تمام آبلہ بردوش کردہ مارا"

بڑے سے بڑے شہنشاہ سے لیکر معمولی کوچہ گرد بھکاری تک اور بڑے سے بڑے عالم سے لیکر ایک غیر متمدن عامی تک سب کی زندگی میں ایسے لمحے کبھی نہ کبھی ضرور آتے ہیں کہ زندگی ایک بار معلوم ہونے لگتی ہے اور دنیا کا یہ نگارخانہ اپنی تمام دلفریبیوں اور نیرنگیوں کے باوجود ہم کو سکون دینے سے قاصر رہ جاتا ہے۔

زبردست سے زبردست مادہ پرست فرعون کو زندگی میں ایسی ساعتوں سے سابقہ پڑا ہے اور پڑتا رہتا ہے جبکہ اس کے اموال و مقبوضات اس کے کام نہیں آتے اور وہ اپنی تمام جاہ و ثروت ساری عظمت و شوکت لئے ہوئے بلا کسی ظاہری سبب کے ایک عجیب بیچینی ایک ناقابل اظہار پراگندگی یا ایک غیر واضح افسردگی محسوس کرنے لگتا ہے اور دنیا کی تمام مسرتوں سے بیزار ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات تو اس عالم انتشار میں ہمارا دم اس طرح گھٹنے لگتا ہے کہ ہم دلکش سے دلکش کلاہ سلطانی کو "بدردِ سر نمی ارزد" کہکر اتار پھینکتے ہیں اور ہماری ہستی کی گہرائیوں سے یہ جانکاہ صدا بلند ہوتی ہے :-

"ہائے کس خواب سے ہستی نے جگایا مجکو"

جاننے والے جانتے ہیں کہ مادیت کے علمبردار استدلالیت کے نبی اور افادیت کے مبلغ جان اسٹورٹ مل کو اپنی زندگی میں کتنی بار ایسے تاب آزما اور جاں گسل تجربے ہوئے ہیں اس پر یکے بعد دیگرے ہیجان اور اضمحلال کے دورے پڑا کرتے تھے اور اس کو کسی پہلو قرار نہ تھا اس نے اپنی "حیات خود نوشتہ" میں ان حالتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے ایسی نازک گھڑیوں میں اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کی ساری بنیاد متزلزل ہو رہی ہے اور کائنات میں کوئی ایسی دلچسپ چیز نہیں ہے جو جینے کا سہارا بن سکے۔ یہ اس شخص کا حال تھا جس کا عقیدہ یہ تھا کہ زندگی کا نصب العین کسب مسرت ہے۔ "بطل پرست" کارلائل بھی ایک عرصہ تک اس روحانی مرض میں مبتلا رہ چکا ہے۔ شب و روز اسکو "دایمی نہیں" کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا اور مقابلہ میں وہ ایک مدت تک ہارتا رہا یہ "دائمی نہیں" دراصل انسان کے اندر اس شیطانی قوت کا نام ہے جو ایمان و ایقان کو فنا کر کے روح کو تشکیک و لا ادریت کے طوفان میں چھوڑ دیتی ہے، یہی "دایمی نہیں" ایک عمر تک امام غزالی کا پیچھا کرتی رہی یہانتک کہ انہوں نے تصوف کی چار دیوار میں پناہ لے لی اور یہاں ان کو قطعاً سکون ملا ہوگا اس لئے کہ "زندگی۔ کائنات خیر و شر

رنج و راحت کی اصلیت سے بہت بڑی حد تک آگاہ ہو چکے تھے، ہر صورت کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ناآسودگی انسان کا مقدر ہے اور اس سے نجات پانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے۔

اور پھر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ہیجان و اضطراب انسانی دنیا ہی تک محدود ہے اور دوسری مخلوقات اس غم سے ناآشنا ہیں؟ کون جانتا ہے کہ زمان و مکان کے تماشہ گاہ میں کون سا الم نامہ پیش کیا جا رہا ہے جسمیں ہر مخلوق کا کوئی نہ کوئی حصہ ہے؟ بہت ممکن ہے کہ شیفتہ کا یہ کہنا واقعتاً صحیح ہو۔

"آرام سے ہے کون جہان خراب میں گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں"

یا بقول مومن:۔

"شبنم خراب تھی وکتاں سینہ چاک ماہ لو اور بھی ستم زدہ کہ روزگار ہیں"

تو پھر کیا ہماری زندگی واقعی ایک عذاب ہے؟ کیا یہ سارا مایا جال قدرت کا کوئی دل آزارانہ استہزا ہے؟ کیا شوپن ہار کا خیال صحیح ہے کہ جس مشیت نے ایک شارہ سے کائنات کا اتنا بڑا کارخانہ پھیلا رکھا ہے وہ ایک شریر قوت ہے؟ دنیا میں اکثر لوگ تو ایسے ہیں کہ ان سوالات پر ایک لمحہ کے لئے بھی سر کھپانا نہیں چاہتے۔ لیکن اس بے اعتنائی سے سوالات کی اہمیت کم نہیں ہوتی ہے اور جو دل و دماغ رکھتے ہیں وہ ان سوالات پر بغیر سر کھپائے ہوئے نہیں رہ سکتے۔

زندگی اگر صرف اندھوں کا کھیل یا کسی جبار ہستی کا ظلم ناروا نہیں ہے تو پھر آخر زندگی ہے کیا، اور اسکی غرض و غایت کیا ہے؟ اس سوال کے مختلف زمانوں میں لوگوں نے مختلف جواب دئے ہیں۔ بیکن نے اپنی مشہور عالم تصنیف "اطلانطس جدید" (Nova Atlantis) میں زندگی کا نصب العین قوانین قدرت کی تحقیق اور علم و حکمت کی ترقی قرار دیا ہے۔ بیچارہ اپنے زمانہ کی شورشوں سے مغلوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ بہر حال بیکن اور اس کے جانشینوں نے زندگی کے مسئلہ کو ریاضیات کا مسئلہ بنا کر چھوڑ دیا۔ وہ کہتے ہیں "ہم کو نہ یہ معلوم ہے، اور نہ یہ معلوم کرنے کی چنداں ضرورت کہ زندگی کی ماہیت کیا ہے، ہم بس اتنا جانتے ہیں کہ انسان احساسات و جذبات رکھنے والا جانور ہے اب جتنا ہی زیادہ انسانی احساسات و جذبات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اتنی ہی زیادہ زندگی خوشگوار ہوتی جائے گی اور اسیقدر زیادہ دنیا رہنے کے قابل جگہ بنتی جائے گی" اور انبساطی جذبات کو بڑھانے کی یہ صورت بتائی گئی ہے کہ ہم قوانین قدرت پر عبور حاصل کریں اور قدرت کو جہاں تک ممکن ہو اپنے قابو میں لائیں۔

اب آئیے تھوڑی دیر کے لئے آجکل کی مہذب دنیا کی سیر کریں جو بیکن کی "اطلانطس جدید" سے قطعاً منزلوں آگے بڑھ چکی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ طبیعیات اور کیمیا نے ہمارے لئے ہر طرح سامان عیش و تفریح بہم کر رکھا ہے ہر وہ بات جو اب سے سو سال پیشتر ناممکن معلوم ہوتی تھی نئی روشنی نے اس کو ہماری زندگی کا ایک کھیل بنا دیا ہے۔ لیکن کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان اب زیادہ پُرسکون زندگی بسر کر رہا ہے، ہمارا تجربہ اس سوال کا جواب نہیں میں دیتا ہے۔ مادیت کے قدم بقدم انسان کی ناآسودگی بھی بڑھتی گئی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ بیکن کے وقت سے کہیں زیادہ آج کل اس پر غور کیا جا رہا ہے کہ انسان کے سکون و اطمینان کی صورت کیا ہو سکتی۔ دنیا کو سیاسی، اقتصادی، علمی اور اخلاقی حیثیتوں سے کیا ہونا چاہیئے؟

یہ سوال ادبیات حاضرہ کا ایک خاص جز بنگیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ زندگی ایک ایسا معمہ ہے جس کو حل کرنا مادیت اور ظاہر پرستی کا کام نہیں ہے۔

سائنس اور تمدن سے مایوس ہوکر اب مذہب اور تصوف کی طرف آئے۔ اسمیں شک نہیں کہ ان دو چیزوں نے انسان کو ایک مہتم بالشان اور جلیل القدر چیز بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ پیغمبروں اور صوفیوں نے ہمکو یہ بتایا کہ ہماری زندگی ایک عکس ہے عالم مثال کا جو تمام کائنات پر محیط ہے۔ زمان و مکان کے مظاہر و حوادث چند آنی و فانی تنوعات ہیں، ایک لازال ہمہ گیر ہمہ داں قوت کے۔ انسان ایک نقش ہے اس قادر مطلق کا جس نے ایک "کُن" سے اٹھارہ ہزار عالم پیدا کرڈالے۔ ہمکو بصد ناز پندار بتایا جاتا ہے کہ

"من ملک بودم و فردوس بریں جایم بود آدم آوردد دریں دیر خراب آباد م"

ہم بذریعہ انفرادو انفصال اپنی اصل سے جدا کردئیے گئے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح "نے" "کاٹ کر نیستان" سے جدا کردی جاتی ہے اب ہماری کوشش یہ ہونا چاہئے کہ جس چیز کو ایک بار کھو چکے ہیں اس کو پھر پالیں، جس فردوس سے ہم ایک مرتبہ نکالے جا چکے ہیں اسمیں پھر داخل ہو جائیں یہ کیونکر ممکن ہے ؟ تقریباً ہر مذہب اور صوفیوں کے ہر فرقہ نے اس کا ایک جواب دیا ہے۔ سورگ کو جیت لینے کی صرف ایک تدبیر ہے اور وہ عبادت ہے بھگتی ہے۔ معرفت ہے گیان ہے اپنے "روزگار وصل" کو پھر حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم تنوعات سے قطع نظر کرلیں اور "اصل" کا دھیان کریں۔ انسان کل میں اسطرح محو ہو جانا چاہئے کہ جزئیات کا احساس تک باقی نہ رہجائے دنیا "دارالمحن" ہے زندگی "سجن المومنین" ہے اور اس سے پیچھا چھوڑانے کی کوشش کرنا ہر ایمان والے کا منصب دلین ہے، اور اس کی یہی ایک تدبیر کہ ہم دنیا و مافیہا کو ایک نقش بر آب ایک نمود بے بود سمجھ کر خاطر انداز کردیں۔ مذہب اور تصوف کا فلسفہ اور اصل و غایت جو کچھ بھی ہو۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ دونوں آخر میں چلکر انسان میں معزولی اور رہبانیت پیدا کردیتے ہیں۔ یعنی زندگی کے مسئلہ کا حل یہ بتایا جاتا ہے کہ زندگی کو تج دو اور یہ کوئی حل نہیں ہوا یہ تو ایک طرح کی بے ہمتی اور نامردی ہوئی۔ زندگی اگر کوئی درد ہے تو اس کا علاج یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اس کی ٹیسوں کی طرف سے بےحس ہو جاؤ۔ اب تک جتنے مبلغین اور متصوفین گذرے ہیں ان سب نے ایک عام غلطی یہ کی ہے کہ عقبیٰ کو دنیا سے الگ سمجھا اور سب نے بلا استثناء یہ کوشش کی کہ انسان کو خدا کیطرف لیجائیں۔ حالانکہ درحقیقت اس کوشش کی ضرورت تھی کہ خدا کو انسان کی طرف لے آیا جائے اور دنیائے انسانیت کا اپنا مرکز قائم رکھتے ہوئے الوہیت کو اس سے قریب کردیا جائے۔ "قطرہ" میں "دجلہ" اور "جز" میں "کل" دیکھنے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ قطرہ کی ہستی کو بھول جاؤ یا "جزو" کو ایک حرف غلط سمجھ لو۔ فنافی اللہ سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ اللہ کی مخلوقات سے بیگانہ ہو جاؤ، عقبیٰ کی فکر اس کو نہیں کہتے کہ دنیا کو ٹھوکر دو۔ عقبیٰ تو دنیا ہی کی ایک ارتقائی صورت ہے۔

زندگی نام ہے چند تعلقات کا۔ چند اعتبارات کا اور جب آپنے ان سے چھٹکارا حاصل کرلیا اور جب آپنے تیاگ کا پرچار شروع کردیا تو آپ جوگی سہی، اللہ والے سہی۔ ولی سہی۔ لیکن کم از کم آپ یہ کہنے کا منھ نہیں رکھتے کہ آپ نے زندگی کے مسئلہ کو حل کرلیا ہے۔ مذہب نے تو خیر دنیا سے کسی حد تک ناتا قایم رکھا۔ لیکن تصوف نے دنیا کو بری طرح مٹانے کی کوشش کی۔ میں یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ تصوف کی بنیاد تیاگ پر ہے بلکہ برخلاف اس کے میرا تو عقیدہ یہ ہے کہ تصوف نام ہے عمل کا اور درس عمل کا۔ لیکن دنیا میں اب تک عملاً ایسے تصوف کا وجود نہیں رہا ہے جس نصب العین اتفاق ہے ستم ظریفی یہ ہے کہ اسی کو آخر میں چلکر نظر انداز کردیتا ہے۔ ایسے صوفیوں کا شمار شاید انگلیوں پر کیا جاسکے جن کو بنی نوع انسان کیساتھ

کوئی عملی ہمدردی رہی ہو۔ رہبانیت اور معزولی کالازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان میں انفرادیت کا جذبہ غالب آجاتا ہے - گردوپیش کے دکھ درد کو محسوس کرنے کی صلاحیت اس میں باقی نہیں رہتی یہی وجہ ہے کہ صوفیوں میں ایک طرح کا جمود پیدا ہوجاتا ہے، اور ان کی ہستی کا ایک جزو مفلوج ہوجاتی ہے، یہ سب جانتے ہیں اور یہ سب کہتے ہیں کہ

"بنی آدم اعضائے یکدیگر اند"

لیکن یہ جانتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے وہ ترک دنیا کی تعلیم دیتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہم اپنی آنکھوں سے یہ دیکھتے ہیں کہ ساری خلقت محنت و ابتلا میں سرگرداں ہے کہیں روٹی کپڑے کا رونا ہے کہیں تندرستی کا۔ کسی کو یار کا غم ہے کسی کو روزگار کا۔ کسی کو کچھ دکھ ہے کسی کو کچھ تو پھر ہم ان سب کی طرف سے آنکھیں کیونکر پھیر سکتے ہیں اور ہم کو اپنی شخصی اشراقیت میں کیا راحت مل سکتی ہے اگر ہم کو یہ دعویٰ ہے کہ ساری کائنات کی اصل نسل ایک ہی۔ ہم سب ایک ہی ابوالبشر کی اولاد ہیں اور ہم سب کو ایک ہی قدرت کاملہ نے پیدا کیا ہے؟ فطرت سلیم رکھنے والوں پر روشن ہے کہ جب تک ہم اپنی مادی زندگی کے کثیف اور پرشور مسائل کو روحانیت میں شامل نہیں کر لیتے جب تک روحانیت کی بنیاد تجرد پر ہے اسوقت تک روحانیت کے ہاتھوں ہم کو سکون ملتا نظر نہیں آتا۔

اب سکون کی تلاش میں صرف دنیائے شاعری کا جائزہ لینا رہ گیا ہے شاعری کا دنیا پر ابتدائے آفرینش سے جو احسان ہے اس کا اعتراف نہ کرنا صریحاً کفر ہے، اگر آج دنیا میں شاعری نہ ہوتی تو زندگی قطعاً عذاب تھی اور خودکشی ہماری نجات کا ذریعہ۔ شاعری نے ہمکو اس قابل بنایا کہ ہم اس عذاب کو راحت سمجھیں اور اپنی دوزخ کو جنت بنالیں۔ شاعری نے جو سب سے بڑا کام کیا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کی دنویت کو قائم رکھتے ہوئے اس کو فردوس میں تبدیل کر دیا ہے۔ شاعر جبتک اسیر مذہب اخلاقیات یا تصوف کا غلبہ نہیں ہوتا، انسان کی انسانیت کو قابل ملامت نہیں سمجھتا۔ وہ ان کمزوریوں کا احترام کرتا ہے جن کی بدولت انسان انسان ہوا، اسکو اس بات پر ناز نہیں ہے کہ انسان کبھی فرشتہ تھا۔ اسکے نزدیک تو زدمباہات کی اگر کوئی بات ہے تو یہ ہے۔

"آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند"

شاعر کا مذہب محبت ہے اور محبت نام ہے تعلقات میں جکڑے رہنے کا۔ محبت کا تقاضا ہے کہ لاکھ تم کو محرومیوں اور مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑے۔ لاکھ ہجر کی سختیاں جھیلنا پڑیں۔ لاکھ الٹی سانسیں لینا پڑیں مختصر یہ کہ زمانہ لاکھ تم کو ستائے تم اپنی محبت میں ہنستے کھیلتے ثابت قدم رہو شاعر اسکو شایان شان نہیں سمجھتا کہ محبت کی صعوبتوں سے گھبرا کر محبوب کو ترک کر دے اور "الاماں" کہتا ہوا گوشہ عافیت اختیار کرلے۔ بلکہ اس کے بالکل برخلاف وہ ہر مصیبت اور ہر غم پر "ہل من مزید" کا ترانہ بلند کرتا ہے۔ وہ اگر روتا بھی ہے تو ہنس ہنس کر اور مزے لے کر۔ وہ ہم کو یہ سبق دیتا ہے کہ زندگی کا راز دھن اور لاگ ہے اور اس کا مقصد حرکت و اضطراب ہے نہ کہ افسردگی اور مجہولیت۔ شاعر جانتا ہے کہ ہمارے "چمن" کی "بہار" نت نئی شکستہ رنگیوں پر منحصر ہے۔ وہ زندگی کی حقیقت کو کماحقہٗ سمجھ چکا ہے جو بقول درد بس اسقدر ہے:-

"مرگ باز نیست کار ہا دارد زندگی انتظار ہا دارد"

یہ مان لیا کہ زندگی ایک بلا ہے اور ہستی کا یہ سارا جنجال کسی شریر قوت کا اندھیر ہے، لیکن ہم اس کو اپنے لئے سرمایۂ راحت بنا سکتے ہیں۔

ہم کو اپنی بےچینیوں میں سکون حاصل کرنا ہے تو ہمکو اپنی کرب کی کروٹوں سے راحت ملے گی۔ راحت یا سکون کوئی خارجی چیز نہیں ہے بلکہ خود اپنے اندر موجود ہے اگر یہ سچ ہے کہ

"تمام کا ہے میرے وہ دکھ جو کسی کو نہ ملا کام کا ہے میرے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا"

تو انسان کو اس خیال سے خوش ہونا چاہئے اور اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھنا چاہئے۔ ہم میں ایک ذوق۔ ایک جوش۔ ایک حوصلہ کی ضرورت ہے، پھر ہماری زندگی کبھی تلخ اور بدمزہ نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم میں شغف اور انہماک کا ملکہ ہے، اگر ہم دھن کے پورے ہیں۔ اگر ہم خلوص کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ:۔

"اگر قضا و قدر ز آسماں فرود آید من خیال تو باخیر و شر چہ کار مرا"

تو پھر یہ سمجھنا چاہئے کہ ہم نے قضا و قدر پر واقعی فتح پائی ہے۔

شاعر کا پیغام یہ ہے کہ اگر آلام و مصائب ہماری قسمت میں ہیں۔ اگر ہم مجبور ہیں تو یہ کیا کم ہے کہ: "ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر" کم از کم ہم کو اپنی مجبوری کے اندر پورا اختیار حاصل ہے اگر ہم تڑپائے جاتے ہیں تو ہمارا کام یہ ہے کہ اپنی تمام قوت تڑپنے لوٹنے اور سر دھننے میں صرف کر دیں "گرانی محمل" کا جواب صرف یہ ہے کہ اپنی "حدی خوانی" کو تیز کر دیا جائے، زندگی کی تکان کو دور کرنے کی یہی ایک صورت ہے، ہستی کا غم یونہی غلط ہو سکتا ہے یعنی زندگی کے مسئلہ کا حل عمل ہے نہ کہ تیاگ اور بیراگ۔

شاعر سے اگر "ذاتیت" (Subjectivism) اور انفرادیت کی خامی دور کر دی جائے اور خدا کا شکر ہے کہ وہ آجکل بہت حد تک دور ہو چکی ہے اور دور ہوتی جا رہی ہے) تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج جبکہ مذہب ایک ڈھکوسلا ثابت ہو چکا جبکہ تصوف کا پردہ فاش ہو چکا ہے۔ جبکہ مادیت کی بےمائگی ظاہر ہو چکی ہے اور جبکہ مجاز اور حقیقت کی لغو تفریق سٹ چکی ہے اور مجاز بجائے خود ایک حقیقت رکھنے لگا ہے۔ انسان کا اگر کوئی نجات دہندہ ہو سکتا ہے تو شاعر جس کا پیغام یہ ہے۔

"عمل کن عمل کن کہ خامی ہنوز"

یہی زندگی ہے اور یہی روحانیت۔

مجنوں گورکھپوری

کتاب سائنس کے عجائب میں کیا ہے؟

(۱) سائنس کے ذریعہ سے تندرستی و بیماری کا حال معلوم کرنا۔
(۲) سال کی اچھائی برائی پر حکم لگانا۔
(۳) ازالۂ مرض کرانا۔
(۴) غالب مغلوب کو پہچاننا۔
(۵) بھاگے ہوئے کا پتہ چلانا
(۶) دل کے حالات معلوم کرنا۔

صرف ۲؍ آنہ کا ٹکٹ بھیجنے سے مفت مل سکتی ہے۔ "مینیجر نگار۔ لکھنؤ"

جن حضرات کا چندہ اس رسالہ ماہ دسمبر ۲۹ء کیساتھ ختم ہوتا ہے

ان کو اطلاع دی جاتی ہے کہ جنوری ۱۹۳۰ء کا پرچہ جنوری کے پہلے ہفتہ میں تیار ہو جائے گا، اگر اس سے قبل پانچروپیہ ذریعہ منی آرڈر وصول ہوگئے تو خیر ورنہ جنوری کا رسالہ دی۔پی کے ذریعہ سے روانہ ہوگا۔

دی۔پی مع محصولڈاک ۵؎ میں ہوگا اور ڈاکخانہ آپ سے دو آنے زاید لے گا، اس طرح گویا ۵؎ ادا کرنا پڑیں گے، منی آرڈر روانہ کرنیکی صورت میں ۳؎ آنہ کی بچت ہوگی۔

جو حضرات رعایتی قیمت پر کتابیں حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہ رعایتی قیمت چندہ کے ساتھ ہی روانہ کردیں تو بہتر ہے۔کتابیں ذریعہ دی۔پی طلب کرنے میں، ان کو اس امر کا انتظار کرنا پڑے گا کہ یہاں نگار کا چندہ وصول ہو جائے۔کیونکہ یہ رعایت نگار کے خریدار رہنے ہی کی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے۔کتاب سائنس کے عجائب۔ بالکل مفت دی جائے گی لیکن اس میں بھی وصول چندہ کی شرط ہے۔یوں ۴؎ کے ٹکٹ موصول ہونے پر روانہ ہوگی۔

نگار کا آئندہ نمبر

۱۶۰ صفحات کو محیط ہوگا اور بعض نہایت بیش بہا مضامین اسمیں ہوں گے، کوئی مضمون ناقص و نامکمل نہ ہوگا۔

جن حضرات کا چندہ دسمبر میں ختم ہو رہا ہے۔ان کو ایک مطبوعہ تحریر اسی رسالہ کے اندر ملیگی۔اس کو ملاحظہ کرنے کے بعد فیصلہ فرمالیجئے کہ آئندہ خریدار رہنے کی صورت میں آپ منی آرڈر بھیجنا مناسب سمجھتے ہیں یا دی، پی طلب فرمانا۔

اَدَبی خُطوطِ غالب

جنکو

مرزا محمد عسکری صاحب بی۔اے لکھنوی نے نہایت محنت و عرقریزی سے کتب مذکورہ بالا سے اخذ کر کے باضافہ ایک بسیط اور مفید مقدمہ اور مرزا غالب کے اکثر مکتوب الیہم کے دلچسپ حالات و نمونہ کلام کے مرتب کیا ہے

حجم ۳۶۰ صفحات تقطیع ۲۲×۱۸ قیمت مع تصویر غالب (عہ)

"منیجر نگار نظیر آباد لکھنو"

باب الاستفسار

ساردا بل، صغر سنی کی شادی، اور ہمارے علما کی غلط فہمیاں

(جناب سید عبدالکبیر صاحب۔ دارجلنگ)

آپ نے اس سے پہلے رسالۂ نگار میں مختصر طور پر اپنی رائے ساردا بل کے موافقت میں ظاہر کی تھی، لیکن وہ رائے غالباً سرسری تھی، اور ضرورت اس امر کی ہے کہ ان دلایل کے مقابلہ میں جو علما کی طرف سے بیان کئے جاتے ہیں زیادہ شرح و بسط سے کام لیا جائے۔ اس لئے موقعہ و محل کے لحاظ سے اگر اس کو دیگر استفسارات پر مقدم سمجھ کر درج نگار فرمائیں گے تو غالباً بے محل نہ ہوگا۔

(نگار) اگر آپ کا یہ استفسار میرے سامنے نہ ہوتا تو بھی میں نے ارادہ کیا تھا کہ اس ماہ کے نگار میں کم از کم بہ سلسلۂ ملاحظات ہی، اس مسئلہ پر زیادہ وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالوں گا، لیکن اب آپ کے استفسار نے اس ارادہ کو اور زیادہ قوی کر دیا اور میں آج کی صحبت میں اس باب پر اپنی رائے واضح طور پر ظاہر کئے دیتا ہوں۔

دنیا کی جتنی مذہبی قومیں ہیں، ان کے قانون و شریعت پر دو طرح بحث ہو سکتی ہے، ایک یہ کہ اصل ماخذ شریعت کو سامنے رکھ کر اس سے کوئی نتیجہ نکالا جائے اور دوسرے یہ کہ تمدنی ضروریات کے لحاظ سے عقل کو راہبر بنا کر تنقید کی جائے۔ چونکہ نکاح کا مسئلہ بھی منجملہ قانون یا شرعی مسایل کے ہے، اس لئے اس پر بھی دونوں پہلوؤں سے گفتگو ہو سکتی ہے اور ہونا چاہئے۔

میں اس جگہ نفس مسئلہ نکاح پر کوئی عقلی یا نقلی بحث نہیں کروں گا اور نہ فلسفۂ ازدواج سے اعتنا کرنا میرا مقصود ہے (مگر اس حد تک کہ ضمناً اس کا ضروری ہو) بلکہ جہاں تک ساردا بل کا تعلق ہے، اسی حد تک اپنی گفتگو کو محدود رکھوں گا اس سے غالباً کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ساردا بل کا نفاذ، جہاں تک وضع قانون کی نیت کا تعلق ہے۔ حد درجہ نیک نیتی کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ اور اس سے کوئی مذہبی یا قومی، تمدنی یا سیاسی استخفاف مقصود نہیں ہے، لیکن فریق مخالف اس کے جواب میں کہہ سکتا ہے کہ صرف حکومت کی نیک نیتی اس امر کی کافی وجہ نہیں ہو سکتی کہ وہ لوگوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرے اور جن باتوں کو ان کے مذہب نے جائز قرار دیا ہے حرام کر دے۔ اور یہی اصل روح ہے تمام مخالفین ساردا بل کے جواب کی، جسکو مختلف اسلوب بیان سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس لئے اگر آج واقعی اس کا فیصلہ ہو جائے کہ مذہب اسلام نے صغر سنی کی شادی کو جائز قرار دیا ہے، تو یقیناً اس بل سے اتفاق کرنا مذہب کی مخالفت ہوگی اور اگر یہ ثابت نہ ہو سکے تو پھر ساردا بل کے خلاف احتجاج شاید ہی کوئی ایسا احمق ہوگا جو عقل کے منافی نہ سمجھے

آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ جتنے علمائے کرام کے بیانات اس باب میں شائع ہوئے ہیں انہوں نے بالاتفاق اس کو تسلیم کیا ہے کہ صغر سنی کی شادی فعل حسن نہیں ہے اور یقیناً بہت سی معاشری خرابیاں اس سے پیدا ہو سکتی ہیں اس لئے میرا سب سے پہلا اعتراض ان حضرات پر یہ ہے کہ اگر اصول صحت و معاشرت کے لحاظ سے صغر سنی کی شادی فعل حسن نہیں ہے، تو کیوں مذہب اسلام نے اس کو جایز قرار دیا، جبکہ شریعت اسلام کو بہترین شریعت تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسکا جواب ان کے پاس صرف یہ ہو سکتا ہے کہ اگر صغر سنی کی شادی کو ممنوع قرار دیا جاتا تو بعض ایسی صورتوں میں جبکہ مصلحتاً اور ضرورت وقت و زمانہ کے لحاظ سے کسی لڑکی کا قبل بلوغ شادی کرنا مناسب ہوتا ہے، ہم مجبور ہوتے اور اس فتنہ و فساد کا سدّ باب نہ کر سکتے جس کے دفعیہ کی بہترین تدبیر صغر سنی کی شادی ہی ہو سکتی ہے۔ اور اسی خیال کی بنا پر انہوں نے احتجاج کیا ہے کہ اس مسئلہ کا انحصار صرف علمار یا رہبران قوم پر ہونا چاہئے تھا اور حکومت کو قانون بنا کر یہ ذمہ داری اپنے سر نہ لینا چاہئے تھی کیونکہ یہ مداخلت فی الدین ہے اور وہ فعل جو کسی مصلحت کی بنا پر حلال قرار دیا گیا ہے، اسے حرام ٹھیرانا ہے۔ سب سے پہلے میں ان حضرات کو ساکت کردوں جو یہ کہتے ہیں کہ اس مسئلہ کا فیصلہ عالمان دین پر چھوڑ دینا چاہئے، اس کے بعد بحث کے دوسرے پہلوؤں پر غور کروں گا۔

میں ان عالمان دین سے جو اپنے آپ کو حامل شرع متین و ہادی راہ یقین کہتے ہیں اور جو قومی معاشرت کی اصلاح کو اپنا فرض اولین قرار دیتے ہیں، یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ صغر سنی کی شادی کا استکراہ کب سے ان کے علم میں ہے، اگر ان کا یہ علم اسی قدر قدیم ہے جس قدر اُن کا وہ جبّہ و دستار جو اعلان فضیلت کے وقت ان کے سر و دوش پر ڈالدیا گیا تھا، تو کیا میں ان سے پوچھ سکتا ہوں کہ اس وقت تک انہوں نے اس رسم قبیح کے مٹانے میں کیا کوششیں کیں اور کتنے مسلمانوں کو اس فعل سے باز رکھا۔ میں ہندوستان کے عرض و طول میں ہر اس شخص سے جو اپنے آپ کو مولوی ہونے کی حیثیت سے نکاح کے عقد و فسخ کا تنہا ذمہ دار سمجھتا ہے دریافت کرتا ہوں کہ کیا اسکی زندگی میں کوئی ایک واقعہ ایسا ہوا ہے جس میں اس نے صغر سنی کی شادی سے انکار کر دیا ہو، انکار نہ کیا ہو یا تو فریقین کو صرف سمجھا ہی دیا ہو کہ یہ فعل محمود و مستحسن نہیں ہے، غالباً وہ نہیں بتا سکیں گے۔ لیکن برخلاف اس کے ہزاروں لاکھوں ایسی مثالیں موجود ہیں جنمیں انہیں مولویوں نے جو آج سارڈا بل کی مخالفت میں گردن کی رگیں پھلا پھلا کر اسٹیج پر آتش فشاں و شعلہ ریز تقریریں کر رہے ہیں، صغر سنی کی شادی پر نہ صرف جواز کے فتوے دیئے بلکہ بغیر کسی مصلحت کے بغیر کسی حیلۂ شرعی کے خود خدا جانے کتنی کمسن لڑکیوں کی قربانی اپنے "عشق پیرانہ سر" کے دیوتا پر چڑھا کر ہمیشہ کے لئے ان کو اس جایز فطری نشاط سے محروم کر دیا جو ایک جوان عورت کو جوان مرد ہی کے آغوش میں میسر آسکتا ہے۔

آج اگر ان ہادیان طریقت کے تمام وہ کارنامے ہم پر ظاہر ہو جائیں جو دراز عباؤں کے وسیع دامنوں میں، لمبی چوڑی داڑھیوں کے طویل سایوں میں اور قرآن و حدیث کی اُس اعجوبہ خیز تفسیر و تشریح کی اوٹ میں جو اُن کے لئے ہر حرام کو حلال اور ہمارے لئے ہر حلال کو حرام بنا دینے میں "سحر سامری" سے کم مرتبہ نہیں رکھتی، کئے جاتے ہیں، تو دنیا یہ دیکھ کر حیران ہو جائے کہ ہمارے کتنے وہ "ناکردہ گناہ"، جن کی حسرت بیاں سے نہ جانے کا ذکر غالب نے کیا ہے ان کے نامۂ اعمال میں کس طرح تو بر تو اور تہ بر تہ پائے جاتے ہیں، اور نہ صرف یہ بلکہ کتنی صورتیں معصیت کی ایسی ہیں جو کبھی ہم غریبوں کے خیال میں بھی نہیں گذرتیں اور یہ ہیں کہ خدا معلوم کتنی بار ان کو "چوم چوم کر" اور "جھوٹا" کر کر کے چھوڑ چکے ہیں اور فسق و فجور کو ایک فن کی حیثیت سے مرتب کر گئے ہیں۔

پھر مجھے حیرت ہے کہ جن کے بطون کا یہ حال ہو انپر کیونکر اصلاح معاشرت کے کسی مسئلہ کا انحصار ہو سکتا ہے اصغر سنی کی شادی پر کس طرح انکا اقتدار مناسب ہے اور بھیڑوں کی چوپانی کیونکر ایک غیر راعی کے سپرد ہو سکتی ہے

اگر کہا جائے کہ ان کو صغر سنی کی شادی کا استکراہ حال ہی میں اس وقت سے محسوس ہوا ہے جب سے یہ تحریک ملک میں شروع ہوئی تو کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ ۱۸۹۶ء سے لیکر (جبکہ اول اول یہ مسئلہ ملک کے سامنے پیش کیا گیا تھا) اس وقت تک کتنی بار انھوں نے اس کے استکراہ لوگوں پر ظاہر کیا اور کتنی لڑکیوں کو انھوں نے اس بلا سے بچایا۔ غالباً ایک بار بھی نہیں۔ پھر جو جماعت ۲۲ سال کے عرصہ میں کوئی ایک مبارک مثال بھی منع و احتراز کی اپنی طرف سے پیش نہ کر سکتی ہو، اس کا آج یہ کہنا کہ "آئندہ ہم ضرور ایسا کرتے" ایسی سفیہانہ نہیں، بلکہ مفسدانہ جسارت ہے جس کے جواب کے لئے یقیناً کسی دلیل کی ضرورت نہیں

اسی سلسلہ میں آئیے ان خطرات پر بھی اک نگاہ ڈال لیں جو ساردابل کے نفاذ سے مولویوں کے نزدیک ظہور میں آ سکتے ہیں۔ مولانا عبد الماجد بدایونی نے (جنکی عزت میری نگاہ میں ان کے فضل و کمال سے زیادہ انکی ذہانت کی وجہ سے قائم ہے) اپنے مکتوب میں جو ممبران اسمبلی کو مخاطب کر کے شائع کیا ہے بہ پندار خود صرف عقلی دلایل پیش کر کے حد درجہ ناصحانہ و مشفقانہ انداز سے نرم لہجہ میں گفتگو کی ہے اور تمام ان خرابیوں کا ذکر کیا ہے جو اس قانون کے نفاذ سے ظاہر ہونے والی ہیں۔ اس لئے میں اس کو سامنے رکھکر بحث کے اس پہلو کو بھی ختم کئے دیتا ہوں۔

سب سے پہلے مولانا نے ممبران اسمبلی کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ:۔

> "میں سمجھتا ہوں کہ صغر سنی کی شادی کے انسداد کی طرف جو قباحت مائل و متوجہ کرنے والی ہوئی وہ صرف یک تھی یعنی "قبل از وقت مباشرت" اگر قابل معافی ہوں اگر برادرانہ اخلاص سے اس غلط فہمی کی طرف جناب کو متوجہ کروں کہ نکاح و مباشرت کو ایک سمجھ لیا گیا۔ شریعت اسلامیہ مباشرت قبل از بلوغ کو ظلم بتاتی ہے اور اسی لئے چاہیے مسلمانوں میں کمسنی کی شادی کی مثال شاذ و نادر کہیں مل بھی جائے مگر مباشرت قبل از بلوغ کے جواز کا ثبوت مشکل ہی سے مل سکیگا اور رواج و عمل کی مثال تو مِس میو جیسی ...... بھی مسلمانوں کے متعلق قطعاً پیش نہ کر سکی"

امر اول کو ہر ذی ہوش انسان تسلیم کرے گا اور اس لئے یہ کہنا کہ ممبران اسمبلی نے دونوں کے فرق کو محسوس نہیں کیا، قیاس مع الفارق ہے، لیکن مولانا کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر بجائے نکاح کے مباشرت کے لئے وقت کی تعیین کر دی جاتی تو انہیں کچھ عذر نہ ہوتا لیکن غالباً مولانا کو معلوم نہیں کہ ۱۳ سال سے کم عمر کی لڑکی سے مباشرت تو پہلے ہی سے تعزیرات ہند میں ممنوع ہے۔ ضرورت تو اس کی تھی کہ ایسے نکاح ہی کو ناجائز قرار دیا جائے جس سے قبل از بلوغ مباشرت کا نہ صرف امکان بلکہ وقوع ہوا کرتا ہے۔ میں مولانا سے دریافت کرتا ہوں کہ اگر تیرہ سال کی لڑکی سے کسی کی شادی ہو جائے تو کیا اس کا شوہر اس کو اپنے گھر نہیں لے جا سکتا اور اگر وہ لیجا سکتا ہے تو پھر اس کا یقین کس کو ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ مباشرت نہ کریگا، جبکہ سیکڑوں واقعے چھ چھ سات سات سال کی لڑکیوں کے عصمت دری کے موجود ہیں۔ چنانچہ بالکل حال کا واقعہ ہے کہ ایک شخص حمید اللہ نے حیدرآباد میں اپنی کمسن بیوی سے مقاربت کر کے اس کو ہلاک کر ڈالا۔ اگر مولانا کے پاس کوئی ایسا ذریعہ ہے کہ وہ نکاح کے بعد لڑکی کی رخصتی کو روک سکتے ہیں یا رخصت ہونے کے بعد اس کے شوہر کو مقاربت سے باز رکھ سکتے ہیں، تو

براہ کرم پہلے اس کو بتائیں تاکہ اسپر غور کیا جائے ورنہ یوں تو وہ خرابی دور نہیں ہو سکتی جس کو وہ خود بھی ظلم سے تعبیر کرتے ہیں اور شریعت کے نقطۂ نظر سے ناجائز۔

امر دوم کے متعلق بصد ادب یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مولانا نے یا تو قصداً "کتمان حقیقت" سے کام لیا ہے یا یہ کہ انہیں حقیقت کا علم نہیں۔ جناب تصدق احمد خاں صاحب شروانی نے جو اعداد و شمار کمسنی کی شادی کے مسلمانوں میں پیش کئے ہیں، وہ نہ صرف یہ کہ ہندوؤں کے قریب قریب ہیں بلکہ کہیں ان سے زیادہ زاید ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ مولانا کی زبان میں "شاذ و نادر" کا استعمال "کثرت اعداد" کی کس حد تک استعمال ہوتا ہے۔

امر سوم میں مولانا فرماتے ہیں کہ مباشرت کا جواز شریعت اسلامیہ میں "مشکل" ہی سے ملسکتا ہے، اگر "مشکل" کے معنے نفی مطلق کے ہیں تو خیر، اور اگر اس کا مطلب ہو کہ ضرورت کے وقت کوئی مولوی اپنے لئے یا کسی اور کے لئے اس کو جایز قرار دے سکتا ہے۔ تو براہ کرم اس طریق استدلال سے آگاہ فرمائیے۔

امر چہارم میں مولانا نے اسی ذہانت سے کام لیا ہے جس کا میں شیفتہ ہوں۔ یعنی مولانا نے "مباشرت قبل از بلوغ" کے رواج و عمل کے انکار کی ذمہ داری خود اپنے سر نہیں لی ہے، بلکہ اس باب میں اپنے اختیارات مس میو کو دیدیے ہیں۔ یعنی مولانا خود تو انکار نہیں کرتے لیکن جب مس میو نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا تو انہیں کیا پڑی ہے کہ وہ خود اس راز کو افشا کریں۔

آگے چلکر مولانا فرماتے ہیں:۔

"چونکہ بلوغ مزاج، آب و ہوا کے لحاظ سے ہر ملک و ہر صنف میں مختلف عمر میں ہوتا ہے اس لئے اسلام نے کوئی عمر مقرر نہیں کی بلکہ صرف بلوغ پر مدار رکھا، البتہ نکاح ہر عمر میں جایز ہے۔ اس میں یہ حکمت ہے کہ بعض اوقات ہر ملک، ہر شہر، ہر خاندان میں ایسے حالات پیش آجاتے ہیں یا آسکتے ہیں، جن کے سبب لڑکی کے متعلق ۱۴ سال سے قبل اور لڑکے کے لئے ۱۸ سال سے قبل تنظیم مآل و حفاظت ماحول، و اصلاح مآل کی خاطر ایسی ضرورتیں ناگزیر ہو جاتی ہیں کہ اگر ان کا نکاح اس وقت نہ کر دیا جائے تو انکی زندگیاں برباد، خاندانی میراث و املاک ضائع یا ان کے ناموس تباہ ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ انگریزی قانون کے ہمہ گیر حول میں شرع اسلامی کے جو چند در بے باقی رہ گئے ہیں وہ نکاح، مہر، طلاق، وقف وغیرہ کے ہیں سارد ا ایکٹ ان سب پر غارتگری کا پہلا حملہ ہے اس قانون کے نافذ ہونے کے بعد کیا ضمانت ہے کہ اسلامی تعدد ازدواج کے بھی خلاف قانون نہ پاس کرایا جائے گا، اور پھر اس کے بعد خلع و طلاق کا قانون بھی انگریزی یا ہندی مزاج کے مطابق نہ بنایا جائے گا۔"

یہ بالکل صحیح ہے کہ بلوغ کی عمر مختلف ہوتی ہے، لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ ہندوستان میں اکثر و بیشتر ۱۴ سال کی عمر میں لڑکی جوان ہو جاتی ہے اس لئے قانون کا نفاذ شاذ مثالوں کے لئے نہیں روکا جا سکتا۔ قانون میں ہمیشہ اکثریت و صلاحیت کو دیکھا جاتا ہے، یعنی یہ کہ اکثر صورتیں کیا پیش آتی ہیں اور بہترین ممکن طریقہ کسی امر کے طے کرنے کا کیا ہے۔ دنیا میں کوئی قانون اس دعوے کے ساتھ پیش نہیں کیا جاتا کہ اسمیں

کوئی مستثنیٰ نہیں ہوسکتا، یا یہ کہ اس میں کسی قسم کا کوئی نقص نہیں نکل سکتا، بلکہ مدعا صرف یہ ہوتا ہے کہ حالات حاضرہ میں بہترین صورت کو اختیار کیا جائے اور اکثریت کو ملحوظ رکھا جائے۔ اس لئے مولانا کی یہ دلیل تو کسی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتی۔ اب رہ گیا سوال مصالح کا، سو وہ بھی تجزیہ کرنے کے بعد کچھ نہیں رہتے۔ زیادہ صاف الفاظ میں گویا مولانا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر لڑکی کی شادی کمسنی میں نہ کردی جائے تو جائداد تباہ ہوجاتی ہے۔ اور کبھی اس کا اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی عصمت نہ کھو بیٹھے۔ اول تو میری سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی کہ کمسنی کی شادی اور تحفظ جائداد میں باہم کیا علاقہ ہے۔ اس کی ایک مثال زیادہ سے زیادہ یہ فرض کی جاسکتی ہے کہ ایک شخص بستر مرگ پر ہے اور اس کی کمسن لڑکی غیر منکوحہ ہے وہ چاہتا ہے کہ کسی سے اس کی شادی کردوں تاکہ جائداد تباہ نہ ہو۔ فرض کیجئے کہ ایسے شخص کو کوئی شخص شادی کے لئے نہیں ملا تو وہ کیا کرے گا، یا یہ کہ بجائے لڑکی کے کمسن لڑکا ہے تو وہ کیا صورت تحفظ جائداد کی اختیار کرے گا۔ عام طور پر یہی دیکھا جاتا ہے کہ جائداد کسی ولی کے سپرد کردی جاتی ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ کمسن لڑکی بھی ولی کے سپرد نہ کی جائے اور وہ بعد بلوغ اس کے نکاح کا فیصلہ کرے۔ لیکن اگر ہم اس کو تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیں تو میں یہ سوال کروں گا کہ ہزار میں کتنے مسلمان صاحب جائداد ایسے ہوتے ہیں جو اپنے بچوں کو کمسن چھوڑ کر مرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ۲۰ فرض کر لیجئے۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا ہزار میں ۲۰ کی رعایت تو ان کی دولتمندی کی وجہ سے کرتے ہیں لیکن ۹۸۰ کا تباہ ہونا گوارا کرلیتے ہیں اس لئے کہ ان کے پاس جائداد نہیں ہے۔ رہا سوال حفاظت عصمت کا سو یہ اس سے بھی زیادہ مہمل ہے۔ کیونکہ خیال عصمت منحصر ہے زیادہ تر تربیت پر۔ اگر لڑکی کی تربیت اچھی ہے تو اس کا اندیشہ نہیں۔ ورنہ بعد بلوغ و قبل بلوغ دونوں طرح اندیشہ رہتا ہے۔ اگر کوئی لڑکی گیارہ سال میں بالغ ہوگئی تو اس کی طرف سے یہ اندیشہ کرنا کہ ممکن ہے وہ عصمت کی حفاظت نہ کرے، اتنا زیادہ قرین قیاس نہیں ہے جتنا شادی کرنے کے بعد تنہا چھوڑ دینے سے۔ پھر یہ اکثر ہوتا ہے کہ شادی کرکے شوہر اپنی جوان عورت کو گھر پہ چھوڑ جاتا ہے اور خود مہینوں بلکہ برسوں کے لئے باہر بہ سلسلہ ملازمت و تجارت غائب رہتا ہے۔ اس لئے مولانا بتائیں کہ شرع میں کہاں اس کی ممانعت ہے۔ اور کیوں نہ ان کے نقطہ نظر سے ایک اور قانون "تمنع ہجر الزوجہ بعد النکاح" نافذ کیا جائے۔

اسی کے ساتھ مولانا نے یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ آگے چل کر نکاح، خلع، طلاق، وراثت وغیرہ کی اسلامی شریعت پر حملہ نہ کیا جائے۔ اس کا جواب میرے پاس صرف یہ ہے کہ "خدا وہ دن تو کرے" البتہ "تعدد ازدواج" کے باب میں جو اندیشہ مولانا کو ہے اس سے میں اختلاف نہیں کروں گا، کیونکہ اگر ایسا ہوگیا تو پھر "غریب مولوی" مر جائے گا، اور اس کی وہ تمام کارگاہ خیال جس کو سامنے رکھ کر فردوس کی موعودہ حوروں کی یاد میں چار چار شادیاں کرنے پر بھی اپنی ہوس کی پوری صیقل نہیں کرسکتا، بالکل درہم برہم ہوجائے گی۔ اور یہ سانحہ اس کے "حیات نشاط" اور "نشاط حیات" دونوں کے لئے کسی طرح قابل برداشت نہ ہوگا۔

یہاں تک تو ہوگئی عقلی بحث، اب آئیے اس سلسلہ میں قرآن مجید کو بھی دیکھ لیں کہ اس مسئلہ میں کیا فرمان ہے۔

کلام مجید میں نکاح کا ذکر چند جگہ آیا ہے اور ان میں کوئی مقام یا کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس سے صغر سنی کی شادی کی اجازت پیدا ہوتی ہو بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہاں بلوغ سے قبل کی شادی ممنوع قرار دی گئی ہے، اور اس وقت تک جتنے نکاح مولویوں نے قبل از بلوغ کئے ہیں وہ سب ناجائز تھے۔ سورہ الروم میں نکاح کی غرض و غایت کو جن صریح الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ

مذہب اسلام نے فلسفۂ نکاح کو کیا سمجھا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

ومن آیٰتہٖ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ

یعنے خدا نے تمہارے لئے جوڑے اس لئے پیدا کئے ہیں کہ تم ان سے جی کا سکون پاؤ اور آپس میں خلوص ومحبت کا رابطہ پیدا ہو۔

ظاہر ہے کہ نہ اس فلسفہ سے بہتر کوئی فلسفۂ نکاح پیش کیا جاسکتا ہے اور نہ کوئی مسئلہ ازدواج اس اصول سے بہتر مرتب ہوسکتا ہے۔ پھر غور کیجئے کہ آیا کمسنی کی شادی میں یہ کیفیت باہم پیدا ہوسکتی، کیا نابالغ بچے اس راحتِ قلب اس سکونِ جاں اور اس لذتِ اتحاد کو سمجھ سکتے ہیں جس کا ذکر کلام مجید میں کیا گیا ہے۔

سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے:۔ فانکحوا ما طاب لکم من النساء "یعنی ان عورتوں سے جو تمہارے دل کو بھائیں نکاح کرو"

ظاہر ہے کہ ایک مرد کے دل میں عورت کی طرف میلان بلوغ کے بعد ہی ہوسکتا ہے اور ایک عورت بالغ ہونے کے بعد ہی پسندیدگی کے قابل ہوتی ہے۔

اس صورت میں یتامیٰ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

وابتلوا الیتامیٰ حتیٰ اذا بلغوا النکاح فان آنستم منھم رشدا فادفعوا الیھم اموالھم۔ یعنی یتامیٰ کی نگرانی کرو اس وقت تک کہ وہ بالغ ہوجائیں اور اگر تم دیکھو کہ وہ ذی شعور ہوگئے ہیں تو ان کا مال ان کے حوالہ کردو۔

غالباً یہ معلوم کرکے لوگوں کو حیرت ہوگی کہ ابوحنیفہؒ نے بلوغ کی عمر اٹھارہ سال قرار دی ہے، جو آج مردوں کے لئے ساردا بل میں تجویز کی گئی ہے۔

کلام مجید میں ایک آیۃ اور ہے جس سے نابالغ لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی ممانعت ظاہر ہوتی ہے ملاحظہ ہو:۔

یاایھا الذین آمنوا لایحل لکم ان ترثوا النساء کرھا۔ اے ایمان والو تمہارے لئے کسی طرح جائز نہیں کہ جبر واکراہ سے عورتوں کے وارث بن جاؤ۔ یعنی مدعا یہ ہے کہ عورتوں سے اجازت حاصل کرکے ان کی مرضی وخوشنودی سے ان کے شوہر ووارث بنو اور ظاہر ہے کہ ایک نابالغ لڑکی اس کی اہل ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی رضامندی کا اظہار کرسکے۔ اس میں اتنی سمجھ ہی نہیں ہوتی کہ وہ اچھے برے میں تمیز کرکے اپنے شوہر یا وارث کا انتخاب کرے۔ اسی لئے اس آیت کے نزول کے بعد اسلام میں کوئی نکاح نابالغ لڑکی سے عمل میں نہیں آیا۔

امام سرخسیؒ نے ذیل کی آیت سے نکاح صغیرہ کا جواز ثابت کیا ہے:۔ والائی یئسن من المحیض من نسائکم ان ارتبتم فعدتھن ثلثۃ اشھر والائی لم یحضن۔

طلاق کے سلسلہ میں عدت کا بیان ہوتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ جو عورتیں کبرسنی کی وجہ سے حائضہ نہیں ہوتی ہیں یا جن کو حیض ہی نہیں آتا ہے انکی عدت تین ماہ ہے۔

اگر اس کو تسلیم کرلیا جائے کہ والائی لم یحضن سے نابالغ لڑکیاں ہی مراد ہیں اور وہ عورتیں مراد نہیں جن کا کسی بیماری کی وجہ سے

حیض بند ہو جاتا ہے، تو بھی اس آیت سے صغیرہ کے نکاح کا جواز ثابت نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ آیت ان نکاحوں کے متعلق نازل ہوئی تھی جو اس سے قبل کی آیت نازل ہونے سے پہلے عمل میں آچکے تھے اور اس لئے اس سے نکاح صغیرہ کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔

کلام مجید کے ساتھ جب احادیث پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے نکاح کے لئے عورت کی اجازت کو بہت ضروری قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ طلب اجازت صغیرہ سے نہیں ہو سکتا، بلکہ وہ بالغ لڑکی سے ممکن ہے۔ چونکہ اس قسم کی متعدد روایات تمام مشہور کتب حدیث میں باب النکاح کے تحت پائی جاتی ہیں، اس لئے ان کے اندراج کی ضرورت نہیں۔ من شاء فلیرجع الیہ

نکاح صغیرہ کے جواز میں لوگوں نے جناب عائشہ کے واقعہ نکاح کو پیش کیا ہے، حالانکہ اصولاً اس سے استناد صحیح نہیں کیونکہ رسول اللہ کا نکاح جناب عائشہ سے قبل اس آیت کے نزول کے ہو چکا تھا جس میں طلب اذن کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کی صورت بالکل وہی تھی جیسی تعدد ازدواج کی تعیین کی کہ اس کی آیت بھی رسول اللہ کی متعدد شادیاں ہو جانے کے بعد نازل ہوئی۔

پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مسئلہ جس کی تصدیق میں قرآن کے احکام صراحتہً موجود ہیں، جس کے باب میں احادیث کی تائید موجود ہے۔ جو طبّاً، تمدناً، اور اخلاقاً ہر طرح مستحسن قرار دیا جاتا ہے، اس سے اختلاف کرنا اور اختلاف بھی ایسا شدید کہ معلوم ہوتا ہے مولویوں کے سر پر کوئی پہاڑ آسمان سے ٹوٹ پڑا ہے، کس عجیب و غریب ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس قانون سے خود مولویوں کی تمناؤں اور آرزوؤں پر پانی پھر جاتا ہے، اور ان کی مخالفت اصلاح معاشرت نہیں، بلکہ خود اپنے جذبات کی رعایت پر مبنی ہے۔

وائسرائے نے جو جواب ڈپوٹیشن کو دیا ہے وہ اس قدر عاقلانہ مدبرانہ بلکہ مولویانہ ہے کہ شاید ہی اس سے بہتر مسکت جواب کوئی ہو سکتا ہے، لیکن مولوی جو قیامت تک نہیں سمجھ سکتا کہ مذہب و شریعت میں کیا فرق ہے، جو مذہب و قوم میں کبھی تمیز نہیں کر سکتا، جس کا ذہن کبھی اس قدر بلند نہیں ہو سکتا کہ وہ سیاسیات کو مذہبیات سے متمایز کر سکے، اس کی سرگرمیاں بالکل حق بجانب ہیں اور اس کا چراغ پا ہونا اس کا فطری تقاضہ۔

بہر حال اب یہ قانون تو مکمل ہو چکا اور دنیا کی کوئی معمولی قوت اس کو منسوخ نہیں کرا سکتی تاوقتیکہ کوئی غیر معمولی مظاہرہ یا سخت خطرناک اجتماع نہ کیا جائے۔ اس لئے میں تمام مولویوں کو جو اس قانون کے مخالف ہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ محض جلسوں، ریزولیوشنوں، تاروں اور ڈپوٹیشنوں سے کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے قربانیوں کی اور یہی چیز ایسی ہے جو آپ کے پاس موجود نہیں۔

اگر سارد ابل واقعی مداخلت فی الدین ہے تو اس سے زیادہ نازک وقت اور کیا آئے گا، کیوں نہیں علمائے کرام احتجاجاً فاقے کرنا شروع کر دیتے اور اگر فاقے ممکن نہیں تو کم از کم قورمہ پلاؤ ترک کر کے "نانِ جویں" ہی پر قناعت کریں کہ کسی طرح تو حکومت کو معلوم ہو جائے کہ جو

گروہ اس قانون کی مخالفت پر آمادہ ہے وہ زیادہ نہ سہی "باندازۂ سر سوزن" ہی تکلیف اٹھانے کے لئے تیار نظر آتا ہے، بہ صورت نفاذ سے قبل اختیار کرنی چاہئے۔ اور جب اپریل سنہ ۱۹۳۰ء میں اس کا نفاذ ہو جائے تو پھر "قانون شکنی" کرنا چاہئے اور ہر مولوی کو کم از کم چار چار شادیاں نابالغ لڑکیوں کے ساتھ کرکے "قید و بند" کی تکالیف برداشت کرنا چاہئے، اسکا نتیجہ جو کچھ ہو لیکن ایک فائدہ تو یقیناً حاصل ہو جائے گا اور وہ یہ کہ جس وقت تمام مولوی قانون شکنی کی پاداش میں جیل بھیجدئے جائیں گے تو کم از کم اتنی مدت کے لئے ضرور دنیا میں امن و سکون پیدا ہو جائے گا اور عالم انسانیت اس عذاب سے چھٹکارا پاکر چند دن تک تو آزادی کی سانس لے سکے گا

رسالہ جن

جنوری سنہ ۱۹۳۰ء کا بہ ادارت حضرت نیاز فتحپوری شایع ہو گیا، اگر آپ نے ابھی تک مطالعہ نہیں کیا تو اب طلب کیجئے اور دیکھئے کہ کیا چیز ہے قیمت سالانہ دو روپیہ چار آنے حجم ڈھائی جز

رسالۂ جن

آپ کو بتائے گا کہ، روح کی حقیقت کیا ہے اور عالم ارواح کس نوع کا عالم ہے (۲) روحوں سے کیونکر گفتگو کیجاتی ہے اور ان کے پیام ہمیں کیونکر حاصل ہوتے ہیں (۳) خواب کی دنیا کیا ہے اور تعبیر خواب کسے کہتے ہیں (۴) اشراقیت جو فلاسفۂ مشائین کی مایۂ ناز چیز تھی کسے کہتے ہیں (۵) مقناطیسی خواب دوسرے پر طاری کرکے کیا کیا کام اس سے لئے جا سکتے ہیں (۶) مسمریزم کے کیا اصول ہیں اور اس سے ہم کیا کام لے سکتے ہیں (۷) دوسروں کے افکار و خیالات جان لینا، بند تحریروں کے مضامین پڑھ لینا کس طرح ممکن ہے۔ (۸) عمل حاضرات کی کیا حقیقت ہے۔ (۹) تختی پر روحوں کی تحریروں کا ثبت ہو جانا، میز کی جنبش سے روحوں کا پیام حاصل کرنا کیونکر ہوتا ہے۔ (۱۰) معمول کی کیا خصوصیات ہیں اور اس کے ذریعہ سے ہم کس طرح پیشین گوئی کر سکتے ہیں (۱۱) یورپ روحانیات کے باب میں کیا کر رہا ہے اور اس کی جدید ترین معلومات کیا ہیں۔ (۱۲) جنات اور بھوت پریت کے متعلق کیسے کیسے عجیب و غریب واقعات لوگوں کے تجربہ میں آئے ہیں

"منیجر نگار لکھنؤ"

ترانہ

فتح کابل

ساقی! در ودے! بر جام وساغر! مطرب! سرودے! بالحن خوشتر!
آمد نویدے، چون گل معطر! کز فضل حق شد، نادر مظفر!
وز تیغ او گشت کابل مسخر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

یک چند کابل! وقف ستم شد! افغانیان را، دل صرفِ غم شد!
ہر قلبِ حساس، صیدِ الم شد! وامروز آخر، دل شاد ہم شد!
از فتح نادر شیر دلاور! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

یک چند ملت! مدہوش گشتہ! در قعرِ ذلت! روپوش گشتہ!
باشیر قالین ہمدوش گشتہ! برجور سقا، خاموش گشتہ!
برداشت آخر! تیغِ دوپیکر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

شیرانِ افغان! خوابیدہ ماندند! دلہاے ملت! ترکیدہ ماندند!
برخاک پستی، غلطیدہ ماندند! در قلب ظلمت، رنجیدہ ماندند!
آخر، عیان شد، صبح منور! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

از غیب آمد، یک مردِ سنگی! افرشتہ پیکر، با روحِ جنگی!

از سطوت او، دل چاک، زنگی! وز ہیبتِ او، لرزان فرنگی!
ضرغام پر دل، شیرِ دلاور! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

بالا بلندے! روئین قبائے! دارا شکوہے! خسرو ادائے!
تیمور تمثال! رستم نمائے! نادر مثیلے! نادر لقائے!
شمشیر درکف! صمصام دربر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

از خاک مغرب! آمد چو طوفان! با چشمِ پر خون! با روحِ سوزان!
از درد ملت! با قلبِ بریان! در کف نمایان! شمشیرِ عریان!
گوئی درخشان! صمصامِ داور! اللہ اکبر! اللہ اکبر!

غمخوارِ ملت! او را چو دیدند! شیرانِ افغان! از جا جہیدند!
چون رعد و باران! یک یک رسیدند! تیغ از نیام، روئین کشیدند!
تیغے! چہ تیغے! یک برق مضطر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!!

با فوج احرار! نادر برون شد! قوم و وطن را! او رہنمون شد!
دلہاے اعدا، در سینہ خون شد! افواجِ سقا! زار و زبون شد!
وز دست او شد، کابل مسخر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

تختِ امانی! آباد بادا!! شمشیر نادر! آزاد بادا!!
شاہ ولی خان! دلشاد بادا!! اعداے محمود، برباد بادا!!
کز تیغ شان گشت ملت مظفر! اللہ اکبر!! اللہ اکبر!!!

محمود شیرانی

ایک تصویر دیکھکر!

یہ حسنِ نازنین! یہ جلوۂ ناز آفرین تیرا!
یہ معصومانہ چہرہ! غنچۂ شاداب کا عالم!
یہ مستانہ نگاہین! اک بہشتی خواب کا عالم!

سراپا، اک خیالِ حور! جسمِ نازنین تیرا!
مجسم، خندۂ خوابِ پری، روئے حسین تیرا!
یہ موتی، یہ جبین، یا انجم و مہتاب کا عالم!
پریشان خواب کا سا، گیسوئے شب تاب کا عالم!
سراپا، اک شعاعِ نور، عکسِ دل نشین تیرا!!

تو از سر تا بہ پا، اک نکہت و تنویر ہے سلمیٰ!
شراب و شعر و موسیقی کی، پنہان تجھ مین، رنگت ہے!
مرے خاموش دل مین موجزن تیری محبت ہے!
بہار اور خواب کا ہیکل! تری تصویر ہے سلمیٰ!
ادا، اس طرح، فرضِ "رونمائی" کچھ تو کر جاؤن!!
تری تصویر، سینے سے لگا لون، اور مر جاؤن!!!

اختر شیرانی

کوئل

ابر اپنے حواس کھو چکے ہین
چادر سے ذرا سرک گئی ہے
دن بھر کی چلی ہوئی ہوائین
فطرت کے چمن کی شاہزادی

آغوش افق مین سو چکے ہین
شاخون کی طرف لچک گئی ہے
خوشبو سے لدی ہوئی ہوائین
پھولون کے وطن کی شاہزادی
گویا ہے سکوت شہر دین مین

ہے رخ پہ پڑی شفق کی چادر
خاموش ہین کوہ و دشت و دریا
بیتاب سی تھک کے ہو گئی ہین
سوتے ہوئے مسکرا رہی ہے
دنیا کی ہر ایک انجمن مین

اور قوس کی ہفت رنگ چھالر
سکتے مین ہے جیسے بزم دنیا
آ کر در گل پہ سو گئی ہین
خاموشی کے گیت گا رہی ہے

مغرب کے شفق کدے مین چھپ کے
پہنے ہین لباس ہائے توسین
ہے نور کہین، کہین سیاہی
اور گود مین سے کے مسکرا کر
قرطاس فلک پہ کتنے نقشے
پانی مین لگی ہوئی ہے آتش
شعلے کا ہے شہر اک نمایان

خورشید اچھالتا ہے ساغر
دامن پہ ٹکے ہین ماہ و پروین
افعی ہے کہین، کہین ہما ہی
پہناتی ہے ابر کو جگا کر
بنتے ہین ابھی، ابھی ہین مٹتے
پھولون مین بسی ہوئی ہے آتش
ہے آگ کا ہر طرف گلستان
سبزہ پہ مین چپ پڑا ہوا ہون

پی کر مے آتشین کی چھاگل
زردی مین گلاب مل رہا ہے
سبزی سے لپٹ لپٹ کے زردی
سرخی مین سیاہی بس رہی ہے
ہے بام افق طلسم منظر
شعلے کی ہین ندیان کہین پر
کہسار ہو، دشت ہو کہ دریا
فطرت کے کرشمے دیکھتا ہون

مدہوش پڑے ہوئے ہین بادل
نارنج سحاب کھل رہا ہے
بنتی ہے زری کی ایک وردی
لالہ کی کلی سی ہنس رہی ہے
دیکھ اے نگہ فلک شناور
اور آگ کی وادیان کہین پر
سب آگ کے بن گئے ہین گویا

مین دیکھ رہا تھا یہ نظارے
گم ہو گئی پھر لگا کے چکر
اُڑتی ہوئی نغمہ گا رہی ہے
ہے آپ تو گم مگر نوائین
اور اُس کی شمیم عطر دامن
کیا جانے کہان ہے ساز تیرا
کس بزم کا راز ہے تو کوئل
پاتا نہین دیکھتا ہون جس دم
لاتا ہے کہین جو ہو کے لوری

اتنے مین اس آتشین فضا سے
جیسے کہ فضا مین برق مضطر
نغمہ کی ہوا مین جا رہی ہے
آباد کئے ہین کل فضائین
مستی مین ڈبو رہی ہو گلشن
معلوم نہین ہے راز تیرا
اتنا تو بتا دے ہون مین سائل
شاید ہے تو نغمۂ مجسم
فردوس سے نیند کی کٹوری

جیسے کہ کوئی سیاہ بجلی
ظاہر ہوئی باغ مین پھر اک دم
پھر چھپ کے کسی شجر پہ تنہا
جیسے کوئی پھول اک چمن مین
گلزار مین ٹہنیون کے اوپر
حیران مین دیکھتا ہون ہر سو
جب چونک کے دیکھتا ہون کیا ہے
جو کو نہ رہا ہے دشت و بن مین
پھولون کو کہین سلا رہا ہے

یکبارگی تو چمک کے نکلی
پھر کھو گئی، گل مین جیسے شبنم
نغمون کا بہا رہی ہے دریا
پوشیدہ ہو پتیون کے بن مین
کہسار مین جھاڑیون کے اندر
آخر ہے یہ کیا صدائے ”کو کو“
کچھ بھی نہین تو مگر صدا ہے
بجلی کی طرح ہر انجمن مین
موجون کو کہین کھلا رہا ہے

جاذب تو یا نوا اے مضطر
یا ڈال کے بادلون کے پردے
یا رات کوئی سمٹ کے، ہر دم
ظاہر مین ہے بے قرار و بے کل
میری ہی طرح ہے تو پریشان

اے مرغِ نوا! یہی ایک غلطی
لب میرے ہنسی کو ہین ترستے
کوئی نہین شاد ہے جہان مین
کہتے ہین سب اپنے اپنے قصے
اب دیکھ کے تجھکو پر ترنم
اور ایسی جگہ پہ مین ہون بیٹھا
ہل اپنا ہوا پہ جوتتا ہون
لیکن نہین تیرا راگ غمگین
تو بے خبر جہانِ نیرنگ
اب جبکہ گھرے ہوئے ہین بادل
بجلی کے چمک رہے ہین کوڑے
کہسار کے دامنون پہ کتنے
جنگل مین کبھی، کبھی چمن مین
شاید اسی بیکلی کے اندر

فطرت کو نہین قرار تیرے
معلوم نہین ہے تجھکو کیا ہے
دل مین ہے کہ دیکھئے نکل کر

پرکیف ہین کتنے یہ نظارے
یا دامنِ ابر برق مضمر
فردوس کے خوش نما فرشتے
پہنے ہوئے یہ لباس ماتم
ہو تیز ہوا مین جیسے بادل
آشفتہ مزاج و اشک افشان
تو میری طرح نہیں پریشان
میرے دلِ غم نما کی یہ بھی
آنکھون سے ہین یاس و غم برستے
سب کرتے ہین آہ اس مکان مین
دن رات یہان یہی ہین چرچے
دل مین ہے مرے عجب تلاطم
ہر ذرہ ہے جس کا غم مین ڈوبا
مین نیند مین ہون کہ جاگتا ہون
دل تیرا ہے ایک ساز زرین
ہر رنگ مین ہے نشاط آہنگ
سنسان ہے شہر اور جنگل
بادل کے اڑے ہوئے ہین گھوڑے
پھرتے ہین مچل مچل کے نالے
فارس مین کبھی، کبھی یمن مین
ہے رازِ نشاط تیرا مضمر
دل تیرا جہانِ آرزو ہے
دل مین ہے بھرا شرار تیرے
کس درد و الم کی یہ دوا ہے
دنیا مین کوئی بہار خوشتر

نغمون کے برس رہے ہین تارے
یا دیکھ کے یہ سنہرے بادل
بیٹھے ہوئے مست گا رہے ہین
اڑتی ہے اس آتشین فضا مین
دم بھر بھی نہین قرار تجھکو
کیا سبزہ و گل کی بھی فضا مین
تو دشت و چمن مین ہے غزل خوان
غم دیکھ رہا ہے جو چمن مین
مجھ سے بھی ہوا کوئی ہے غمگین
کوئی ہے شکار مفلسی کا
کیا سعی کرین کہ پا بہ گل ہین
کہسار مین، دشت مین چمن مین
اے کاش تری طرح چمن مین
اے مرغِ طرب، ہو انشیمن
جنت کی ہین جس مین کل نوائین
اُس وقت بھی تھی تو پر ترنم
راتین ہین سیاہ، ہو کا عالم
زورون سے برس رہا ہے پانی
اب بھی تو چہک رہی ہے ہر سو
اک جا پہ نہین قرار تجھکو
کیا رمز ہے تیری زندگی کا
پامال و شہید جستجو ہے
گھلنے وطن سے دل لگانا
اک خواہش نو بہار تجھکو
اُس باغ و بہار کے مناظر

خود نغمہ سرا ہوا ہے جنگل
ہر سمت مجھے پکار رہے ہین
گاتی ہوئی ہر طرف ہوا مین
کس شے کا ہے انتظار تجھکو
ہین شاہدِ غم کی جلوہ گاہین

خشکی مین، تری مین، شہرون مین
اے دہرِ کہن، طلسم آئین
شکوہ ہے کسی کو بیکسی کا
مجبور ہین، سخت خستہ دل ہین
بیٹھی تو جہاں ہی ہے بنا مین
اڑتا پھرون مین بھی دشت و بن مین
ہے گو کہ سیاہ تیرا دامن
اور بزم ازل کی خوش صدائین
جب پھول کھلے تھے مثل انجم
دنیا پہ ہے اک سکوت پیہم
پانی کی ہے ہر طرف روانی
ویسا ہی ہے اب بھی شور "کوکو"
کیسا ہے یہ اضطرار تجھکو
اس نغمے کا اس شگفتگی کا؟

یا آفتِ آشیان اٹھاتا
دیتی ہے کہین قرار تجھکو؟
امید کے یہ نئے عناصر

کر دیتے ہین محو آکے دل مین — بس جاتے ہین راہ پاکے دل مین
اور دیکھ کے تو یہ گل طرازی — گاتی ہے نوائین تازی تازی
یون اڑتی ہے چھو کر ہر چمن کو — باقی نہین رنج اور محن کو
غم ہے نہ کہین فسردگی ہے — تیرا یہ اصولِ زندگی ہے

شمیمی۔ بی۔ اے

ایک دوست کی موت سے متاثر ہو کر

کوئی روتا ہے سرِ گورِ غریبان ہائے ہائے — رات کو یہ عالم شہر خموشان ہائے ہائے
ہے کھنچی آنکھون مین تصویرِ گلستان ہائے ہائے — نو گرفتارون کی پہلی شام زندان ہائے ہائے
پیچھے پیچھے موت ہے آگے خدا کا نام ہے — کاٹتا ہے یون کوئی راہ بیابان ہائے ہائے
رک چلی ہے بادِ صرصر ہو کا عالم ہو چلا — دشت مین وہ آمدِ شام غریبان ہائے ہائے
یاد آتی ہین کسی شوریدہ سر کی وحشتین — دیکھکر گلکاریٔ دیوارِ زندان ہائے ہائے
ایک سناٹے کا عالم تھا در و دیوار پر — تیرے مرنے پر وہ پہلی شام زندان ہائے ہائے
اے ہوائے فصلِ گل تیری شرر انگیزیان — باغ مین ہر گل ہے شعلہ در گریبان ہائے ہائے
نور کا عالم تھا جوشِ مے سے میخانے مین رات — وہ چھلکتے جام وہ بزمِ چراغان ہائے ہائے
مرنے والے خاک ویرانون مین اڑتی ہے ترے — بادِ صرصر ہے تری گہوارہ جنبان ہائے ہائے
یہ گھڑی بھی آئی اور جیتا ہون مین فرقت نصیب — چھوٹتا ہے ہاتھ سے دامانِ جانان ہائے ہائے
ہم فریبِ حسن سے بیزار کیون ہون اے فراق — بھول جائین کیا کسی کے عہد و پیمان ہائے ہائے

فراق گورکھپوری

نیند

دامنِ شمشیر مین کس لطف سے آتی ہے نیند — کوئی ٹکڑا خلد کا گویا اٹھا لاتی ہے نیند
کانپ جاتے ہین ستارے عشق کی فریاد سے — حسن کی دنیا مین جب ہر سمت چھا جاتی ہے نیند
کارفرما کس کے جذبِ عشق کی تاثیر ہے — اے خدا مجھ کو کہان ہر روز لے جاتی ہے نیند
آہ جب بیداریون مین بھی سرودِ خواب تھا — یاد آجاتی ہین وہ راتین تو اڑ جاتی ہے نیند
ساری دنیا مین ہے جس بیدادگر کا نام موت — تیرے کوچے مین جو آجائے تو کہلاتی ہے نیند
صبح تک دنیا کا کس کو ہوش رہتا ہے نظیر — رات بھر گویا شرابِ ناب برساتی ہے نیند

اصغر حسین نظیر لودھیانوی

مشاہدات وارادات

اک شاعر شہرت یافتہ نے کل بزم سخن مین نظم پڑہی
اس طرح کہ پوری محفل مین ہنگامۂ تحسین برپا تھا
ہر لفظ سے پھوٹی پڑتی تھی، تنویر ضیائے حسن اثر
شاعر کے لبون پر شہرت کا دلچسپ تبسم پیدا تھا
اس نظم کے بعد اب شمع پھری اک اور سخن گو کیجانب
"گمنامی و ناپرسی" جس کی تا شاد جبین پہ لکھا تھا
جو اس نے پڑہی اس محفل مین، سرشار لطافت نظم نہ تھی
کہسار کے فردوسی دامن مین، چشمہ شیرین بہتا تھا
کیا تجھسے کہون کیا داد ملی شاعر کو مگر اس کاوش کی
مین دیکھ کے طرز اہل سخن ہمراز بس اتنا سمجھا تھا

یہ بزم جہانستان حقیقت خود محرم حقیقت ہے
معبودِ خداوندان سخن دراصل خدائے شہرت ہے

(۲)

عقل کو سمجھا ہے تو اسرارِ عالم پر محیط — مین تجھے پیغام دیتا ہون کہ غافل ہوشیار
تیری منزل ہے فریبستان اوہام وقیاس — خود حجاب چشم ہے جس مین جمالِ آشکار
تو نے یونہی کی ہے موجودات عالم پر نظر — اے رہین شبنم و نا واقف ابربہار
دیکھتا ہو، خواب سے جس طرح کوئی چونک کر — جسکی آنکھون مین ہو گہری نیند کا باقی خمار

جسکو دھندلے سے نظر آئین مناظر گرد و پیش
اور اس موہوم بینش، پر اُسے ہو اعتبار

سید علی اختر - اختر

ایک شاعر کا انجام

مُصنفہ نیاز فتحپوری

اڈیٹر نگار کا سب سے پہلا افسانہ حسن و عشق، جسمیں تخیل کی بلندی، زور تحریر، اسلوب بیان اور ندرت انشار کے ایسے ایسے پاکیزہ نمونے موجود ہیں جو ساحری کی حد تک پہونچے ہیں۔ جوش محبت کے جذبات جس مستانہ پن سے اس تصنیف میں ظاہر کئے گئے ہیں اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ افسانہ جناب نیاز نے عنفوان شباب کا لکھا ہوا ہے۔

قیمت مع محصولڈاک ۱۲/ر۔ "مینجر نگار۔ لکھنو"

جذبات بھاشا

مصنفہ نیاز فتحپوری

ہندی شاعری میں جو لوچ اور کیفیت ہے، اس کا علم انہیں کو ہو سکتا ہے جنہوں نے اس زبان کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے اس کتاب کو دیکھئے اور جذبات و خیال کی پاکیزگی کی داد دیجئے۔

قیمت فی جلد ۱۲۰/ر

"مینجر نگار۔ لکھنو"

خلاف تحریر ہو تو قیمت واپس

ہمارے کارخانہ قائم شدہ ۱۹۱۴ء کی تیار کردہ مقبول عام پیتل کی خوبصورت پالش شدہ منٹوں میں سیروں نفیس و لذیذ رومالی سویاں تیار کرنے والی

نو ایجاد مشین سویاں

وزن معمولی
حجم کم
پرزے مختصر و مضبوط

قیمت فی مشین پیتل پالش شدہ چھلنی دو عدد (سوراخ ۱، ۲) ملا؎ علاوہ محصولڈاک وغیرہ

ملنے کا پتہ:۔ ھندوستانی ایجاد گھر دھلی

- پرتاب ۱۲/
- روہنی ۱۰/

مولانا شرر مرحوم

- جنید بغدادی عہ/
- حکیم نومیہ ۳/
- قرۃ العین ۱۳/
- محذرات عہ/
- جویاے حق للعہ
- لعبت چین عہ/
- فاتح مفتوح عہ/
- بابک خرمی عہ/
- الفانسو ۱۲/
- ایام عرب ع/
- قیس و لبنیٰ عہ/
- یوسف و نجمہ عہ/
- زوال بغداد عہ/
- مینا بازار عہ/
- مقدس نازنین عہ/
- رومۃ الکبریٰ عہ/
- فلپانا عہ/
- شوقین ملکہ عہ/
- منصور موہنا ۸/
- حسن انجلینا ۸/
- ملک العزیز ورجنا ۱۲/
- فردوس بریں ۸/
- حسن کا ڈاکو عہ/
- دربار حرام پور ۱۰/
- غیب دان دلہن عہ/
- بدر النساء کی مصیبت عہ/

- میوۂ تلخ ۸/
- نیکی کا پھل عہ/

شوق قدوائی مرحوم

- ترانۂ شوق عہ/
- قاسم و زہرہ عہ/
- نیرنگ جمال ۴/

میر ولی اللہ بی اے

- بندگی عاہ/
- کاس الکرام ۳/
- لسان الغیب جلد اول ۳/
- 〃 دوم ع/
- 〃 سوم عاہ/
- 〃 چہارم ع/
- نمکدان فصاحت عہ/
- بادۂ ناب عہ/

ظفر عمر بی اے

- چوروں کا کلب ۹/
- نیلی چھتری عہ/
- بہرام کی گرفتاری عہ/

مولانا نیاز فتحپوری

- گہوارۂ تمدن عا/
- نگارستان عا/
- صحابیات عا/
- تاریخ الدولتین عہ/

سید سجاد حیدر بی اے

- نہرا ۱۳/
- جلال الدین خوارزم شاہ عہ/
- خیالستان عہ/
- ثالث بالخیر ۸/

- حکایات و احساسات عہ/

دلچسپ تاریخی و جاسوسی ناول

- سراب فیشن ۸/
- بالشوک شہزادی ۸/
- شہید وفا ۸/
- ممتاز بیگم ۸/
- شعلۂ رنگین ۸/
- محاصرۂ پیرس عہ/
- شیخ چلی عہ/
- بہادر ترک ۸/
- بہرام کی واپسی ۸/
- انقلاب فرانس عہ/
- حسن بنارس ۸/
- نظرتی جاسوس عہ/
- ترکی حرم سرا ۸/
- جنگ طرابلس ۸/
- بہرام چور عہ/
- زر پرست عہ/
- کنجی کا راز عہ/
- عبد الرحمٰن ناصر عا/
- عروس مصر عا/
- سیلاب خون عہ/
- کرشمہ عہ/
- وفادار دلہن عہ/
- طواف زمین عہ/

- سیاحت زمین عہ/
- سیاحت عہ/
- نازنین مراکش ۸/
- سمندر کی سیر عاہ/
- اسرار بالشوزم عہ/
- روح لیلیٰ ۳/
- امین بک عہ/
- حجاج بن یوسف عہ/
- یوسف پاشا عہ/
- انقلاب عثمانی عہ/
- نیلی چھتری عہ/
- بہرام کی آزادی ۱۲/
- بہرام کی گرفتاری عہ/
- بہرام کی سرگزشت عہ/
- پراسرار قتل عا/

ادبی کتابیں

- مکمل شرح دیوان غالب ۳/
- بزم خیال عہ/
- مشاطۂ سخن عہ/
- انشاء النسوان ۶/
- مکاتیب محسن الملک عہ/
- لیلیٰ مجنوں ڈراما ۸/

مراثی

- مراثی دبیر عاہ/
- مراثی انیس للعہ
- مراثی ضمیر عہ/

- مراثی مونس ۱۲/
- مراثی دلگیر ۱۲/

تذکرۃ الشعرا

- تذکرۂ حسینی ۱۱/
- گلشن ۱۰/
- سراپاے سخن عہ/
- سوانح نظیر اکبرآبادی عہ/

دواوین فارسی

- دیوان شمس تبریز عہ/
- کلیات عراقی ۱۲/
- دیوان حافظ عہ/
- دیوان نعمت خاں عالی عہ/
- کلیات انوری عا/
- دیوان بیدل ۱۰/
- کلیات سعدی عہ/
- دیوان عرفی ۱۲/
- کلیات جامی عہ/
- کلیات غالب عہ/
- کلیات صائب ۱۲/
- کلیات حزیں ع/
- دیوان عنصری ۱۴/
- دیوان ظہیر فاریابی ۶/
- دیوان غنی کشمیری ۶/
- دیوان ناصر علی ۵/
- دیوان ہلالی ۶/
- کلیات جلال اسیر عہ/

دواوین اردو

- دیوان حسن دہلوی ۶/
- کلیات ظفر ع/

- کلیات مومن عہ/
- دیوان ناسخ عہ/
- کلیات میر عہ/
- کلیات سودا عہ/
- کلیات انشا عہ/
- کلیات نظیر اکبرآبادی عہ/
- گلزار داغ عہ/
- دیوان رند ۹/
- دیوان ذوق ۳/
- کلیات اسمٰعیل ع/
- مراۃ الغیب عہ/
- مثنوی زہر عشق ع/
- فریاد داغ ۴/
- دیوان قائل ۸/
- دیوان شہیدی ۴/

عجائب و غرائب

- عجائب المخلوقات مع تصویر رنگین للعہ
- 〃 بلا تصویر سادہ للعہ
- مجمع الفنون عہ/
- طلسم فرنگ عا/
- کارخانۂ عالم عہ/

رنالڈز کے ناولوں کے ترجمے

- الدین دلیلی عہ/
- فریب حسن عا/
- سوزن عشق عہ/
- ابزا الیمبرٹ للعہ
- ناول اسرار ع/
- شام جوانی عہ/
- طلسمی فانوس عہ/

نگار بک ایجنسی

نظیر آباد لکھنؤ

تصانیف مولٰنا نیاز فتحپوری

صحابیات

جس میں عہد سعادت کے ۵۰ خواتین کے
مستند حالات درج ہیں۔ اس کا مقدمہ مولانا کی
خاص زبان و انشا میں ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے
قیمت فی جلد ۶؍

نگارستان

زیر طبع ہے

شاعر کا انجام

نیاز فتحپوری کے عنوان شباب کا لکھا ہوا
فسانہ جو زور انشا و حسن بیان کے لحاظ
سے عجیب و غریب چیز ہے
قیمت مع محصول ۱۲؍

شہاب کی سرگزشت

اردو میں پہلا فسانہ ہے جس میں نفسیاتی تحلیل
کے لحاظ سے سیرت نگاری کی گئی ہے۔ یہ امر
مسلم ہوچکا ہے کہ اردو میں اس سے بہتر تخییل
اور بلند انشا کا فسانہ کوئی شائع نہیں ہوا۔
قیمت فی جلد عہ؍

جذبات بھاشا

ہندی شاعری میں جو لوچ اور کیفیت ہے اس کا
علم انھیں کو ہوسکتا ہے۔ جنھوں نے اس زبان
کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب کو دیکھیے
اور جذبات و خیال کی پاکیزگی کی داد دیجئے۔
قیمت فی جلد ۱۲؍

تاریخ الدولتین

جرجی زیدان مصری مشہور مورخ اسلام کی
تاریخ تمدن اسلامی کے ایک حصہ کا ترجمہ
جس میں عہد بنی امیہ و بنی عباس کی سیاسی
تاریخ پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے۔
قیمت فی جلد عہ؍

علم فراست الید

یعنی ہات کی لکیروں کو دیکھکر ایک شخص کی سیرت اور اس کے ماضی
و مستقبل کے حالات معلوم کرنے کا علم۔ اس فن پر ایک سلسلہ
مضامین نگار میں شایع ہوا تھا۔ اب اسے خوبصورت جیبی سائز میں
مرتب کیا جارہا ہے اور اخیر دسمبر ۱۹۲۸ء تک شایع ہوجائیگا۔ اس
کتاب میں اس فن کے تمام مشکلات اسقدر آسان زبان میں حل کئے
گئے ہیں کہ ہر شخص مطالعہ کرنے کے بعد نہایت معمولی مشق سے ہات دیکھکر
صحیح احکام صادر کرسکتا ہے قیمت فی جلد عہ؍

ظریف شاعروں کا تذکرہ
یا
تذکرۂ خندۂ گل

اردو فارسی کے جتنے ظریف شاعر گزر چکے ہیں یا اب موجود ہیں ان سب کے حالات
مع ان کے لطائف و ظرائف اور نمونۂ کلام کے یکجا کردیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب اپنے
موضوع اور دلچسپی کے لحاظ سے اردو میں پہلی کتاب ہے حجم ۵۰۰
صفحات قیمت مع محصول للعہ؍

فلسفۂ مذہب

جو سلسلہ وار نگار میں شایع ہوچکا ہے زیر طبع ہے